شمیم حنفی

آپ اپنا تماشائی

شمیم حنفی

آپ اپنا تماشائی

آپ اپنا تماشائی

(ڈراموں کا انتخاب)
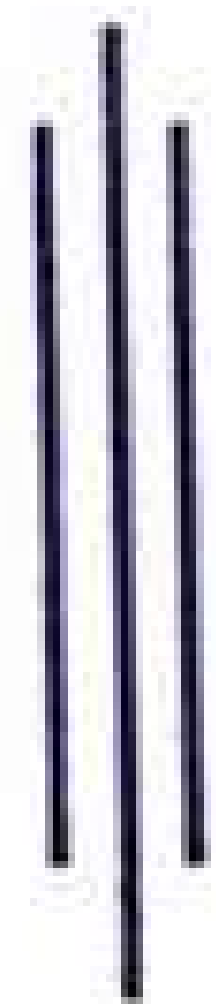
مصنف:
شمیم حنفی

ناشر:

تخلیق کار پبلشرز

C-54، گلی نمبر-۵، اے-ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

نام کتاب : **آپ اپنا تماشائی** (ڈرامے)

مصنف : شمیم حنفی

پتہ : ۱۱۴-بی، ذاکر باغ، اوکھلا، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

Ph:- 011-26836451 Email:- s.hanfi@hotmail.com

تعداد : ۴۰۰

ناشر : انیس امروہوی
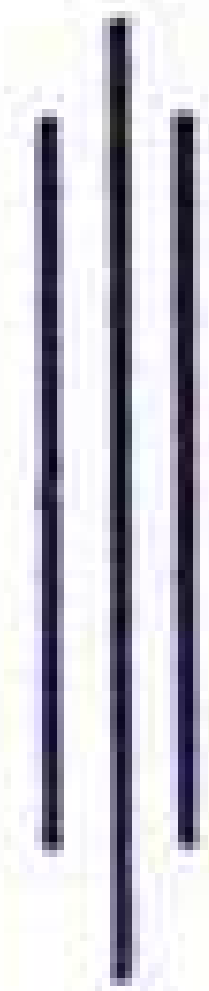
○ **تخلیق کار پبلشرز**

54-C۔ گلی نمبر۔۵، جے۔ ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

سر وَرق : مسعود التمش

کمپوزنگ : رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

مطبع : روشن پرنٹرس، چوڑی والان، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

ملنے کے پتے:

- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- کتاب والا، پہاڑی بھوجلہ، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴ (بہار)
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۱ (یو۔پی)
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، نزد جے۔جے۔اسپتال، ممبئی۔۴۰۰۰۰۸

T.P.: 0274
ISBN: 978-93-80182-92-6

AAP APNA TAMASHAI (Dramas)
2014

By SHAMEEM HANFI
Rs. 280.00

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

54-C, F./F., Street No. 5, J - Extension, Laxmi Nagar, DELHI-110092

Ph.:011-22442572, 9811612373 E-mail:qissey@rediffmail.com

محبوب الرحمن فاروقی اور ثریا فاروقی

کے لیے

○
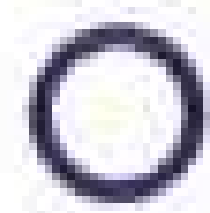
مسعود بھائی

انور صدیقی

اور

ابرار احمد حنفی

کی یاد میں

○○
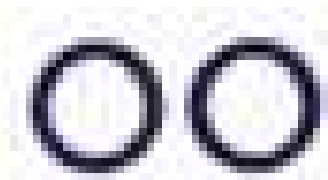
میرؔ جنگل پڑے ہیں آج یہاں

لوگ کیا کیا یہیں تھے کل بستے

شب رفت سحر نہ شد شب آمد

مرزا عبدالقادر بیدلؔ

صبح ہوتی نہیں دیکھی ہم نے

رات گزری تھی کہ پھر رات آئی

احمد مشتاقؔ

فہرس

مٹی کا بلاوا (پہلی اشاعت: ۱۹۸۰ء)

مجھے گھر یاد آتا ھے (پہلی اشاعت: ۱۹۸۵ء)

زندگی کی طرف (پہلی اشاعت: ۱۹۸۸ء)

بازار میں نیند (پہلی اشاعت: ۱۹۹۸ء)

OO

دُھوپ کی دستک

ڈھوپ کی دستک

آوازیں :

چچی	:	(نجمہ) اختر اور نسیمہ کی چچی
نسیمہ	:	اختر کی بہن
ابا	:	اختر اور نسیمہ کے ابا
امی	:	اختر اور نسیمہ کی امی
اشرف	:	اختر کا دوست
اختر	:	نسیمہ کا بھائی

ابتدائی موسیقی

[فیڈ آوٹ]

[فیڈ اِن]

(دروازے پر دستک)

چچی : (باہر سے) نسیمہ...... اوئی نسیمہ۔ (دستک) افوہ! اری کیا کر رہی ہے بیٹی اب تک! نسیمہ!!

نسیمہ : (اندر سے دھیمی آواز) اوں...... کون؟ چچی امی؟ آتی ہوں۔ (اُٹھ کر دروازہ کھولتی ہے۔)

چچی : (اندر آتے ہوئے) بیٹی آخر تجھے کیا ہو گیا ہے؟ دِن ڈھل گیا۔ دیکھ! آنگن کی طرف ذرا دیکھ! کچھ پتہ ہے؟

نسیمہ : پتہ؟ کس بات کا؟

چچی : شام ہو گئی۔

نسیمہ : وہ تو روز ہی ہوتی ہے چچی امی! (بیزاری سے) روز ہی تو شام ہوتی ہے۔

چچی : بیٹی کچھ تو اپنی صحت کا خیال ہونا چاہیے آدمی کو...... یہ آٹھوں پہر کمرے

میں بند؟

نسیمہ : (بیزاری سے) اونہہ...... پھر کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟

چچی : (سوچتے ہوئے) کہیں بھی...... اور کہیں نہ سہی پڑوسیوں کے یہاں تک ہو آیا کرو۔ اس روز رضیہ آئی تھی۔ کہتی تھی یہ نسیمہ باجی اتنی چپ چپ سی کیوں رہتی ہیں؟ نہ کسی سے ملتی ہیں؟

نسیمہ : جی۔

چچی : نہ ہنستی ہو نہ بولتی ہو کسی سے بیٹی...... یہ آخر اتنی سست کیوں ہو؟ کیا جی اچھا نہیں؟ ذرا دیکھوں تو ماتھا (وقفہ) ارے...... تمہیں تو بُخار ہے۔ توے کی طرح جل رہی ہے پیشانی۔ آنکھیں بھی لال لال سی ہیں۔

نسیمہ : (اُداس سی ہنسی) چچی امی!

چچی : (حیرانی سے) تو کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟

نسیمہ : (ہنستی ہے) میں اچھی بھلی ہوں چچی امی! آپ تو ناحق وہم کرنے لگتی ہیں۔ (ہنستی ہے۔)

چچی : نہیں! نہیں بیٹی! اس طرح نہ ہنسو، مجھے ہول اُٹھتا ہے۔ تمہارا جی اچھا نہیں ہے۔ ابھی بلواتی ہوں ڈاکٹر کو۔ اختر...... اختر کہاں گیا؟ دیکھیں تو شام ہونے کو آئی اور ابھی کچھ پتا نہیں...... کہاں غائب ہیں۔ اچھا ٹھہرو! کسی اور کو بھیجے دیتی ہوں۔ رضیہ کا بھائی تو گھر پر ہوگا۔

نسیمہ : (اُکتا کر) چچی امی...... میں بالکل ٹھیک ہوں چچی امی!

چچی : اونہہ! ضد نہیں کرتے بیٹی۔ خدانخواستہ ملیریا نہ ہو۔ سردی تو نہیں لگی؟ مچھر بھی تو اتنے سارے ہیں اس علاقے میں۔ غضب خدا کا رات بھر بھن بھن کرتے رہتے ہیں۔ آج سے تم مچھردانی لگا کر سوؤ گی، سمجھیں!

نسیمہ : (ہنستی ہے)

چچی : تمہاری تو مت ماری گئی ہے۔ ایسا بھی کیا کہ اپنا ہوش نہ ہو کسی کو! میں ابھی

بلواتی ہوں ڈاکٹر کو۔ (جاتی ہیں، نسیمہ کرسی کھسکا کر بیٹھتی ہے)

[موسیقی.......... منظر بدلتا ہے]

[فیڈ اِن]

ابا : (لمبے لمبے سانس، بھرائی آواز) آج لگتا ہے آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ اتنا پانی تو کبھی نہ برسا تھا (کھڑکی کے پٹ بند ہوتے ہیں) اُف کوئی ہے نہیں۔ یہاں کوئی نہیں کیا (بارش کا شور) ذرا! ذرا یہ کھڑکی بند کر دو! چٹخنی چڑھا دو (پیروں کی چاپ پاس آتی ہوئی۔)

امی : ارے آپ اُٹھ بیٹھے۔ یہ کیا ہے؟ لیٹ جائیے۔

ابا : یہ کھڑکی بند کر دو۔ دیکھو بجلی چمک رہی ہے۔ اتنی تیز بارش! میرے خدا! (ہانپنے لگتے ہیں)

امی : آپ لیٹ تو جائیے۔ لیٹ جائیے چپ چاپ، میں ذرا پانی کی بوتل لینے چلی گئی تھی۔

ابا : کیوں؟

امی : کیسا ہے پسلیوں کا درد؟ زیادہ تکلیف تو نہیں؟

ابا : تکلیف! اوں ہوں۔ ٹھیک ہوں اب۔ لاؤ بوتل مجھے دے دو اور تم بھی سو جاؤ! بچے کیا کر رہے ہیں؟

امی : بچے سو رہے ہیں...... دیر سے سو رہے ہیں۔ (بادل گرجتے ہیں)

ابا : چلو اچھا ہے...... سو رہے ہیں۔ اتنے شور میں بھی ان کی نیند نہیں ٹوٹی۔ آج اسکول گئے تھے بچے؟

امی : ہاں۔

ابا : کیسا دن گزرا آج اُن کا؟ آپس میں لڑے تو نہیں؟

امی : (کچھ سوچ کر) اب یہ رات گئے آپ ان کے لیے کیوں پریشان ہو رہے

ہیں؟ سو جایئے۔

ابا : (ہنس کر) سو جاؤں! (کمزور آواز میں) کیسے سو جاؤں؟ آنکھوں پر کس کا بس ہے؟ بچے سو رہے ہیں نا؟

امی : ہاں، سو رہے ہیں۔ آپ بھی سو جایئے۔

[وقفہ]

ابا : کچھ باتیں کرو بیگم!

امی : باتیں۔

ابا : ہاں...... یا پھر سو جاؤ...... تم بھی سو جاؤ۔

امی : میں سو جاؤں گی...... لیکن آپ کو نیند آجائے۔

ابا : (ہنسی) مجھے...... مجھے...... نیند کہاں آتی ہے؟ نیند نہیں آتی تو دماغ بھی اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔ اور دماغ بھٹکتا رہتا ہے تو نیند نہیں آتی۔ عجیب سلسلہ ہے۔

امی : عجیب سلسلہ ہے۔

ابا : ہاں...... بہت عجیب اور یہ سلسلہ تو عمر بھر کا ہے۔ اماں مرحومہ کہا کرتی تھیں، اس گھرانے میں سب کو جاگنے کا مرض ہے۔ ابا بھی بہت کم سوتے تھے۔

امی : کم سوتے تھے! کیوں؟

ابا : پتہ نہیں کیوں...... خدا جانے کیا سبب تھا؟ لوگ اندازہ لگاتے رہے، کسی کو کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ بس رات بھر جاگتے رہتے تھے۔ ان کے کمرے میں رات بھر روشنی رہتی تھی۔ مجھے کچھ کچھ یاد ہے۔

امی : آپ کو یاد ہے اتنی پُرانی بات؟

ابا : ہاں...... نئے اور پُرانے میں کیا بھید ہے۔ بھول جاؤں تو کل کی بات بھی پُرانی۔ نہیں تو سب کچھ نیا۔ مجھے تو کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ وقت شاید آگے بڑھا ہی نہیں۔ بس لوگ کہیں چلے گئے۔

[وقفہ]

امی : اب سو جایئے، اب تو بارش بھی بند ہو گئی۔

ابا : (سوچتے ہوئے) آں ہاں...... بارش...... بند ہو گئی۔ پھر یہ کیسا شور ہے؟

امی : شور...... نہیں تو...... (کھڑکی کھولتی ہیں، ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آتا ہے اور اک تصویر دیوار سے گر پڑتی ہے)

ابا : (ہانپتے ہوئے) بند کرو، بند کرو یہ کھڑکی۔ دیکھو ہوا کا جھونکا آیا اور ابا کی تصویر نیچے گر گئی...... ابا کی تصویر ہے نا؟

امی : (اُداس لہجے میں) شاید!

ابا : (اُٹھتے ہوئے) ذرا دیکھو، تصویر خراب تو نہیں ہوئی۔

امی : آپ...... آپ لیٹے رہیے، میں دیکھتی ہوں۔ (تصویر اُٹھاتی ہیں) بس شیشہ ٹوٹ گیا ہے، تصویر بچ گئی۔

ابا : شیشہ...... شیشہ ٹوٹ گیا۔ تصویر پر خراشیں تو آ گئی ہوں گی؟ کیوں؟

امی : بس ایک آدھ جگہ۔

ابا : لاؤ، مجھے دِکھاؤ تصویر۔

امی : (روہانسی ہو کر) آپ ذرا سی بات سے اتنے پریشان کیوں ہو جاتے ہیں۔ میں سنبھال کر رکھے دیتی ہوں، صبح دیکھ لیجیے گا۔

ابا : صبح! (بھرآئی ہوئی آواز میں) اور صبح نہ ہوئی تو؟

[ہیجان خیز موسیقی کی ایک لہر...... منظر بدلتا ہے]

چچی : نسیمہ اُٹھو...... بیٹی...... شام ہو گئی۔ تم اب تک سو رہی ہو۔

نسیمہ : (جمائی لیتے ہوئے) اوں ہوں۔ چچی امی۔

چچی : ذرا دیکھوں تو ماتھا (وقفہ) یا اللہ! شکر ہے، بخار تو اُتر گیا۔ لیکن چہرے کی رنگت کیسی ہلدی جیسی ہو رہی ہے! لگتا ہے بدن میں خون کا نام و نشان نہیں۔ کتنا کہتی ہوں ذرا کھانے پینے کا دھیان رکھو۔ لیکن تمہیں تو لگتا ہے کھانے

کے نام سے متلی ہوتی ہے۔ دوپہر کو موسمیاں چھیل کر رکھی تھیں۔ جوں کی توں پڑی ہیں۔ لو کھالو۔

نسیمہ : چچی امی اِس وقت تو............

چچی : اِس وقت کیا؟ ہر وقت وہی بہانے بازی۔ لو...... میں اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہوں۔

نسیمہ : (ٹھنک کر) چچی امی...... (قریب آتے ہوئے قدموں کی چاپ)

چچی : کوئی آ رہا ہے۔ کون ہے؟

اشرف : (بھائی آواز میں) آ جاؤں میں؟

چچی : (اُٹھتے ہوئے) اوہ اشرف! آؤ بیٹے آؤ۔ میں تو تمہاری ہی راہ دیکھ رہی تھی۔

اشرف : آداب۔

چچی : جیتے رہو بیٹا۔

نسیمہ : آداب!

اشرف : آداب...... کہیے، کیسی طبیعت ہے اب؟

نسیمہ : میں؟ ٹھیک تو ہوں۔ چچی امی ناحق پریشان ہو جاتی ہیں۔ مجھے کچھ بھی تو نہیں ہوا۔

اشرف : کچھ بھی نہیں۔ خوب، اگر اِسی کو ٹھیک ہونا کہتے ہیں تو پھر بیمار کسے کہتے ہیں؟ لیجیے یہ تھرما میٹر...... ذرا ٹمپریچر لے لوں۔

نسیمہ : (بے دِلی سے) بخار وُخار کہاں ہے مجھے؟

اشرف : پھر بھی یہ لیجیے...... (وقفہ) چچی جان، نسیمہ نے دوائیں تو وقت پر کھالی تھیں؟

چچی : ہاں، وہ تو کہو میں مسلط رہی۔ ورنہ اس لڑکی کو تو دوا سے دشمنی ہے۔ کتنی منت سماجت کے بعد صبح سے چائے کی دو پیالیاں حلق میں اُتری ہیں...... بس...... کتنا کہا کہ موسمی کی ایک دو قاشیں کھالے۔ لیکن دیکھو، پلیٹ جوں کی توں رکھی ہے۔

اشرف : یہ تو بہت بُری بات ہے۔ مریض اگر ڈاکٹر سے تعاون نہ کرے...... لائیے تھرما میٹر...... اب بخار تو نہیں ہے، لیکن ابھی علاج جاری رہے گا۔

نسیمہ : جب میں بیمار نہیں ہوں تو پھر علاج کیسا؟

اشرف : چچی جان، آپ چائے نہیں پلائیں گی کیا؟

چچی : (اُٹھتے ہوئے) اوہ...... ہاں ہاں...... تم دونوں باتیں کرو، جب تک میں چائے تیار کرواتی ہوں۔

اشرف : نسیمہ!

نسیمہ : جی!

اشرف : آپ واقعی بیمار نہیں ہیں۔

نسیمہ : جی؟

اشرف : آپ بیمار نہیں ہیں...... آپ ٹھیک کہتی ہی۔

نسیمہ : پھر...... پھر یہ دوا کے لیے اتنی ضد کیوں ہے؟

اشرف : صرف اس لیے کہ آپ اپنے کو بیمار سمجھنے لگیں۔ بخار یوں ہی آ گیا تھا۔ اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔

نسیمہ : میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

اشرف : آپ خود کو اگر سچ مچ بیمار سمجھنے لگیں تو اس سے ایک فائدہ ہوگا۔ آپ یہ سوچنے لگیں گی کہ علاج ہوتا رہا تو آپ دو چار روز میں ٹھیک بھی ہو جائیں گی۔

نسیمہ : تو اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔

اشرف : شرط یہ ہے کہ اپنے آپ کو بیمار نہ سمجھیں۔ صرف اسی شرط پر آپ کو دوا سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ سمجھ میں آیا؟

(نسیمہ ہنستی ہے)

اشرف : آپ بس ایک کام کیجیے۔

نسیمہ : کیا؟

اشرف : صبح سے شام تک یوں گھر میں بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں۔

نسیمہ : کروں بھی کیا؟

اشرف : مصروفیت کا کوئی بہانہ...... کچھ بھی! جی چاہے تو یونیورسٹی میں کسی لینگویج کا ڈپلوما کورس جوائن کر لیجیے۔

نسیمہ : (بے دلی سے) اونہہ!

اشرف : چلئے، اگر پڑھنے لکھنے سے ایسی ہی بیزاری ہے تو پینٹنگ کا سامان منگوایئے اور صبح سویرے باہر نکل جایا کیجیے۔ پھر دیکھئے باہر کا منظر کتنا دل فریب ہے۔

نسیمہ : (بے دِلی سے) باہر سے کیا ہوتا ہے؟

اشرف : وہ تو ٹھیک ہے۔ اصل میں منظر اندر کا بدلنا چاہیے۔

نسیمہ : (بے تحاشہ ہنستی ہے) اندر کا منظر! اندر کا منظر!!

اشرف : یہ میں شاعری نہیں کر رہا ہوں نسیمہ۔ میں نے تو ایک سیدھی سادی بات کہی تھی۔ آدمی ہر وقت اپنے آپ میں گم رہے تو خود اپنے آپ سے بھی بور ہونے لگتا ہے...... ہے نا؟

نسیمہ : ہوں......!

اشرف : اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ذرا اپنے علاوہ بھی لوگوں کو دیکھئے۔ لوگ نہ سہی، پیڑ پودے، پرندے، پھول، بادل، آسمان، پھر دریا کا کنارہ آپ کے گھر سے آخر کتنی دُور ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔

نسیمہ : (اُداسی سے) وہاں تو میں کبھی کبھی جاتی ہوں۔

اشرف : لیکن کس وقت؟

نسیمہ : شام کو۔

اشرف : شام......شام......شام...... مجھے سب پتہ ہے۔ اختر نے مجھے بتایا تھا۔ آپ شام سے اتنا ڈرتی کیوں ہیں؟ شام......؟ آخر شام بھی تو ایک ایسی گھڑی کا نام ہے جو گزر جاتی ہے۔

نسیمہ : (کچھ سوچتے ہوئے) شام...... گزرتی کہاں ہے...... مجھے تو وقت کا سارا سلسلہ ایک شام سے دُوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی، پھر پانچویں......

اشرف : (قہقہہ لگاتا ہے)

نسیمہ : (افسردگی سے) یہ آپ ہنسے کیوں؟

اشرف : آپ تو بچوں کی طرح گنتی گننے لگی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ تو ختم ہونے کا نہیں۔

نسیمہ : شام کا سلسلہ بھی تو ہمیشہ کا ہے۔ یہ سلسلہ بھی تو ختم ہونے کا نہیں ہے۔

اشرف : نہیں...... ایسا نہیں ہے...... شام کے بعد......

نسیمہ : (ہنستی ہے)

اشرف : آپ کو ہنسی کیوں آ گئی؟

نسیمہ : آپ یہی کہنے جا رہے تھے نا کہ شام کے بعد صبح بھی آتی ہے!

اشرف : (حیرت سے) ہاں، پھر؟

نسیمہ : اس قسم کی باتیں مجھے بور کرتی ہیں۔ مقولوں کی کوئی بھی کتاب اُٹھا لیجیے۔

اشرف : لیکن آپ یہ کیوں بھولتی ہیں کہ مقولے بھی انسانی تجربوں کے نتیجے میں ہی سامنے آتے ہیں۔ آپ کا تجربہ شام سے...... ٹھیک ہے، لیکن صبح! صبح بھی ایک تجربہ ہے۔

نسیمہ : تو ہم اسی طرح تجربے کرتے رہیں؟

اشرف : ہاں! اس میں حرج ہی کیا ہے؟

نسیمہ : زندگی تجربہ گاہ تو نہیں۔

اشرف : پھر کیا ہے؟

نسیمہ : جانے کیا؟ خیر چھوڑیے۔ چچی امی نے ابھی تک چائے نہیں بھجوائی!

اشرف : چائے تو میں پی چکا تھا۔

نسیمہ : لیکن آپ ہی نے تو............

اشرف : صرف اس لیے کہ آپ سے کچھ باتیں کر سکوں۔

نسیمہ : (پُر خیال انداز میں) باتیں! باتیں! باتیں!

اشرف : مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ اس سے گھبراتی ہیں۔ لفظ اس خلاء کو بھر نہیں سکتے جس میں آدمی خود کو آٹھوں پہر گھرا ہوا پاتا ہے۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ گھر سے باہر نکلیے۔

نسیمہ : باہر بھی تو ہم، اپنے آپ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ کہاں جائیں؟ اور کیوں جائیں...... باہر کیا رکھا ہے؟

اشرف : اور گھر میں کیا رکھا ہے؟

نسیمہ : (اُداسی سے ہنستی ہے) یہاں میں ہوں۔

اشرف : (پُرخیال انداز میں) اسی آسیب سے تو آپ کو نکالنا چاہتا ہوں۔ آپ پھر کہیں گی کہ میں کتابی باتیں کر رہا ہوں۔ لیکن کتابیں بھی تو آخر کسی نہ کسی تجربے ہی کا اظہار ہوتی ہیں۔ خیر، میں تو بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انسان اگر چاہے تو کچھ وقت دُوسروں کے ساتھ بھی گزار سکتا ہے۔ (ہنس کر) آپ اگر قبول کریں......تو...... میں اپنی خدمات بھی پیش کر سکتا ہوں۔

[موسیقی...... منظر بدلتا ہے]

امی : (گلاس میں پانی اُنڈیلتے ہوئے) یہ لیجیے پانی!

ابا : اتنا پانی برسا...... اتنا پانی...... مگر میری پیاس بجھتی ہی نہیں۔

امی : لیجیے...... پانی پی لیجیے اور کوشش کیجیے کہ آنکھ لگ جائے۔

ابا : ابھی تو بہت رات باقی ہے۔ (ہوا کا شور)

امی : بہت کہاں...... بادل ہیں آسمان پر!

ابا : اور چاند؟

امی : چاند کہاں؟

ابا : ستارے؟

امی : (اُداس) ستارے بھی نہیں...... بدلی چھائی ہوئی ہے)

ابا : اور بچے؟

امی : بچے سو رہے ہیں ابھی۔ آپ اِتنی فکر کیوں کرتے ہیں؟

ابا : میں نے کتنے دِنوں سے چاند نہیں دیکھا۔ نہ ستارے دیکھے اور بچے......
(پُرخیال انداز میں) اُنہیں کب دیکھا تھا......؟

امی : شام تک تو یہیں تھے آپ کے کمرے میں۔ کتنا تو شور مچا رہے تھے، پھر میں نے باہر بھیج دیا۔ دیر تک اپنا ہوم ورک کرتے رہے، پھر سو گئے۔

ابا : اکیلے سوتے میں ڈرتے تو نہ ہوں گے؟

امی : (کانپتی ہوئی آواز) میرے خدا...... آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ اتنا کیوں پریشان کرتے ہیں اپنے آپ کو...... اَب سو جایئے۔

ابا : (بھرائی ہوئی آواز) کیسے سو جاؤں؟ نیند آئے تب نا...... نیند آتی ہی نہیں۔

امی : کوشش کیجیے۔

ابا : کیسی کوشش! اچھا تم کچھ اور بات کرو۔ یا تم بھی سو جاؤ۔ پھر شاید مجھے نیند آجائے۔ (کراہتے ہوئے) آہ!

امی : (گھبرا کر) کیا پھر شروع ہو گیا درد پسلیوں میں؟ پانی بدل دوں بوتل کا؟

ابا : (بھرائی ہوئی آواز) نہیں...... ابھی گرم ہے...... لیکن تم ذرا سوچو۔ کتنے دِن ہو گئے، نہ میں نے چاند دیکھا نہ ستارے نہ سورج۔

امی : سب اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔ آپ ذرا چلنے پھرنے لگیں، پھر......

ابا : تو کیا میں چلنے پھرنے لگوں گا پھر سے......؟ کتنے دن ہو گئے میں نے کوئی راستہ بھی نہ دیکھا۔ نہ کوئی گلی، نہ محلّہ، نہ کسی راہ گیر پر نظر پڑی۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ زندگی کے سارے ہنگامے اس کمرے کی دیواروں میں سمٹ آئے ہیں۔ یہیں بستر پر پڑے پڑے میں اِس کے دُکھوں، اِس کی اُلجھنوں اور اِس کی اذیتوں کا احساس کرتا رہتا ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ زندگی اس کمرے سے باہر...... مسرتوں سے خالی نہیں ہے۔ باہر پھول ہوں گے اور

درخت اور پرندے لیکن......

امی : (جذباتی لہجہ) آپ ناحق اتنا سوچتے ہیں۔ اتنا نہ سوچئے۔ آپ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔

ابا : (ہانپتے ہوئے) دو مہینے کم نہیں ہوتے۔ ساٹھ دِن...... میں نے یہ سارے دِن اِسی بستر پر گزارے ہیں۔ مجھے کچھ پتا نہیں باہر کیا ہو رہا ہے۔ بچے بھی میرے پاس آتے ہیں...... تو ڈرے ڈرے سے...... انہیں اتنا ڈر کس بات کا ہے۔ بتاؤ؟ تم نے تو اُن سے کچھ نہیں کہہ دیا؟ تم بھی مجھ سے چھپاتی ہو؟

امی : (روہانسی ہوکر) میرے خدا...... آپ جاگتے رہیں گے اور اسی طرح اپنے آپ سے اُلجھتے رہیں گے۔ سو جایئے...... خدا کے لیے سو جایئے۔

ابا : (بھرائی ہوئی آواز) وقت آئے گا تو سو جاؤں گا بیگم۔ ابھی جاگنے کی گھڑی ہے اور نیند ابھی میرے پاس آنے سے ڈرتی ہے۔ اُسے معلوم ہے شاید کہ میں سونا نہیں چاہتا۔

امی : (رونے لگتی ہے)

ابا : تو تم بھی اب مایوس ہوتی جا رہی ہو۔ اگر نہیں، تو پھر یہ آنسو کیسے؟ بتاؤ! تم تو کہتی تھیں کہ میں ٹھیک ہوں...... یا ٹھیک ہو رہا ہوں اور بہت جلد اس کمرے سے باہر نکل کر میں ان درختوں سے باتیں کروں گا، جو میرے سامنے جوان ہوئے اور اَب جن میں نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہوں گی۔ تم رو کیوں رہی ہو؟

امی : (خود کو سنبھالتے ہوئے) میں رو کہاں رہی ہوں...... آپ پریشان ہوتے ہیں تو میں بھی پریشان ہو جاتی ہوں۔ آپ ٹھیک ہو جائیں تو میں بھی ٹھیک رہوں گی۔ میری زندگی......

ابا : تمہاری زندگی...... کیا مطلب؟ تم یہی کہنا چاہتی ہو نا کہ تمہاری زندگی میری زندگی سے الگ کوئی معنی نہیں رکھتی...... ہے نا؟ (وقفہ) لیکن...... مجھے اسی بات کا تو دُکھ ہے! کاش تم میرے بغیر بھی......

امی : (روتی ہوئی) چپ ہو جایئے۔ خدا کے لیے چپ ہو جایئے۔ ایسی باتیں نہ کیجیے۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ خدا کے لیے ایسی باتیں منہ سے نہ نکالیے۔

[موسیقی...... منظر بدلتا ہے]

چچی : اختر...... بیٹے!

اختر : جی چچی امی!

چچی : کیا کہا اشرف نے...... ملے تھے تم آج؟

اختر : جی!

چچی : کیا کہا اُس نے؟

اختر : یہی کہ نسیمہ کی بیماری جسمانی نہیں، ذہنی ہے۔ اسے ضرورت ہے کسی ایسے دوست کی جس کے ساتھ وہ اپنے کمرے سے باہر نکل سکے۔

چچی : تو بیٹا تم تو اُسے لے جاتے ہو شام کو؟

اختر : مجھ سے وہ باتیں تو کرتی نہیں۔ چپ چاپ ایک بینچ پر جا کر بیٹھ جاتی ہے اور بس غروب کا منظر دیکھتی رہتی ہے...... اِدھر سورج ڈوبا اور اُس کی اُلجھنیں بڑھنے لگیں...... نیند آتی نہیں۔

چچی : پھر......؟

اختر : پھر کیا؟ نیند نہ آنے کی وجہ سے وہ بیمار پڑتی رہتی ہے۔ اشرف کا مشورہ ہے کہ اگر وہ خواب آور دوا کھانے پر رضامند نہ ہو تو کسی اور بہانے دوا دے دی جائے۔

چچی : لیکن کب تک...... آخر کب تک......؟

اختر : جب تک اس مسئلے کا کوئی حل نہ نکلے۔ اتنا جاگنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ وہ جاگتی رہتی ہے اور سوچتی رہتی ہے اور اس لیے نیند نہیں آتی۔

(کال بیل بجتی ہے۔)

چچی : بیٹے ذرا دیکھو تو...... اشرف ہوگا۔ [وقفہ]

اشرف : (اندر آتے ہوئے) آداب عرض چچی جان!

چچی : کون؟ اشرف......؟ جیتے رہو بیٹا۔ ابھی ہم تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے، بیٹھو۔

اشرف : (اختر سے) کیا ہوا؟ کل وہ باہر گئی تھیں؟

اختر : ہاں گئی تھیں۔ بس ذرا دیر کے لیے۔

اشرف : کس وقت؟

اختر : تقریباً چھ بجے۔ اس سے پہلے وہ باہر نکلتی ہی نہیں۔ چھ بجے بھی بڑی مشکل سے تیار ہوتی ہے۔ اب تو وہ جب تک اندھیرا نہ پھیل جائے، اپنے کمرے میں ہی بند پڑی رہتی ہے۔

اشرف : خیر! پھر کیا ہوا؟

اختر : ہونا کیا؟ میں نے کتنا چاہا کہ کہیں اور جانے پر رضامند ہو جائے لیکن اس نے بس وہی روز کی رٹ لگا دی۔ بڑی مشکل سے تو تیار ہوئی تھی، میں نے بھی پھر ضد نہیں کی۔

اشرف : (پُرخیال انداز میں) ہوں!

اختر : ہم دونوں گھر سے نکلے اور...... اور بس دریا تک چلے گئے۔ وہاں جا کر بینچ پر بیٹھ گئی۔ چپ چاپ ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھتی رہی۔ راستے میں اس کا یہ حال رہتا ہے کہ نگاہ کسی طرف اُٹھتی ہی نہیں۔

اشرف : (اُسی انداز میں) ہوں!

اختر : سورج ڈوب گیا تو اُسی طرح کھوئی کھوئی سی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر کہا، اب واپس چلیں۔ واپسی پر بھی وہی حال...... گم صم...... گھر آئی اور پھر اپنے کمرے میں۔

اشرف : اس وقت کہاں ہیں؟

اختر : (بجھی ہوئی ہنسی کے ساتھ) سوائے اپنے کمرے کے اور کہاں ہو سکتی

ہے۔ ملو گے؟

اشرف : (سوچتے ہوئے) آں ہاں۔ ذرا دیر بعد...... رات سوئی تھیں؟

چچی : پتہ نہیں کتنی دیر سوئی بیٹے۔ رات دو بجے کے قریب میں اُٹھی تھی تو اس کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ ایک روز میں نے کہا کہ وہ میرے کمرے میں سو رہا کرے۔ اس پر وہ آمادہ نہ ہوئی۔ کہنے لگی کہ اُس کی وجہ سے میری نیند خراب ہوگی۔

اشرف : اُس کی ضرورت نہیں ہے چچی جان! وہ تنہا رہنا چاہتی ہے تو رہنے دیجیے۔ آج دوا کھائی تھی؟

چچی : ہاں! ہزار منتیں کرنے کے بعد۔

اشرف : ٹھیک ہے، پھر اُسے نیند بھی آجائے گی۔ اچھا تو میں ذرا مل لوں؟

چچی : جاؤ...... یا کہو تو بُلا لاؤں۔

اشرف : نہیں، اس کی ضرورت نہیں! میں خود جاتا ہوں۔ (جاتا ہے)

[موسیقی............ منظر بدلتا ہے]

ابا : پرندے جاگ گئے۔ اب سویرا ہونے والا ہے کیا؟ ذرا سا کھڑکی کے پردے سمیٹ دو۔ (وقفہ) اماں مرحومہ بتاتی تھیں کہ ابا بھی صبح سویرے کھڑکی کے پردے کھنچوا دیتے تھے۔ خود تو کچھ دیکھ نہ سکتے تھے کہ ہلنے ڈلنے میں بھی تکلیف ہوتی تھی۔ مگر...... اسی سے خوش ہو جاتے تھے کہ کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور وہ کم سے کم آسمان کا ایک ٹکڑا بستر پر پڑے پڑے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کبھی کبھی...... کوئی اکیلا پرندہ پل بھر کے لیے اپنے پر پھڑپھڑاتا سامنے آتا اور پھر آنکھ سے اوجھل ہو جاتا۔ اماں مرحومہ کہتی تھیں کہ ابا اس منظر کا بہت لطف لیتے تھے اور اس کے منتظر رہا کرتے تھے۔

امی : (دِھیرے سے) پرندے جاگ گئے، اب تو آپ سو جایئے۔

ابا : آں...... ہاں...... اب تو ہمیں بھی کچھ کچھ نیند آرہی ہے۔ لیکن تم بھی تو رات بھر جاگتی رہی ہو نا۔ تم بھی سو جاؤ (وقفہ) لیکن...... (دھیمی ہنسی) اگر تم بھی سو گئیں اور بچے جاگ گئے تب...... اب تو وہ ذرا ہی دیر میں اُٹھنے والے ہوں گے۔ کیوں؟

امی : آپ فکر نہ کیجیے...... میں دن میں سولوں گی۔

ابا : تو تھوڑی دیر میں بھی اور جاگ لوں۔ بچوں سے ذرا باتیں تو کرلوں۔ اُٹھنے دو اُنہیں۔ اُس کے بعد سولوں گا۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) ہے نا؟

امی : آپ کو نیند آرہی ہے۔ پپوٹے بھاری ہو رہے ہیں۔ سو جایئے، سو جایئے آپ۔

ابا : نیند...... نیند کہاں آرہی ہے؟ تمہیں یوں ہی خیال آرہا ہوگا۔ پلکیں یوں ہی بھاری بھاری سی لگ رہی ہوں گی۔ آنکھیں ہی کچھ ایسی ہیں۔ ابا کی آنکھیں بھی ایسی ہی تھیں...... جاگ رہے ہوتے تب بھی ایسا لگتا کہ بس...... کھڑے کھڑے سو جائیں گے (پرندوں کی آوازیں) پرندے جاگ رہے ہیں۔ ذرا دیکھو تو آسمان روشن ہوتا جا رہا ہے نا...... رات بھر اوس گری ہوگی پتّیوں پر...... کیسا عجیب منظر ہوتا ہے پتوں پر اوس کی بوند کا بھی...... اور جب سورج کی کرنیں بوند پر پڑتی ہیں...... تو...... تو کتنے رنگ جھلملانے لگتے ہیں۔

امی : سو جایئے...... سو جایئے اب......!!

ابا : ہاں، سو جاؤں گا...... سو جاؤں گا میں۔ ابھی اخبار والا بھی آتا ہوگا۔ ذرا دیر سے آتا ہے یہ اخبار والا۔

امی : سات بجے تک آئے گا اخبار۔ آپ جب تک سو رہیے۔

ابا : سات بجے تک......؟ اوہ...... اور وہ لڑکی جو دُودھ لے کر آتی ہے، اس کے آنے کا وقت بھی ہو رہا ہے۔

امی : وہ بھی سات بجے تک آئے گی۔

ابا : سات بجے تک...... اور بچے کب تک اُٹھیں گے؟ اُن کی اسکول بس کے

آنے کا وقت کیا ہے؟

امی : سات بجے کے بعد...... سوا سات بجے کے قریب۔ چھ بجے تک اُنہیں جگا دوں گی۔

ابا : (ہنس کر) کیسی بے فکری کی نیند ہوتی ہے بچپن کی۔ اماں مرحومہ بتاتی تھیں کہ کئی بار ابا نے مجھے دیر سے اُٹھنے پر سزا دی تھی۔ صبح صبح وہی اسکول تک پہنچا دیا کرتے تھے۔ گھر سے تھوڑی ہی دُور پر تھا، کوئی دس بارہ منٹ کا راستہ۔ یہ اُن کا روز کا معمول تھا۔ اماں جلدی جلدی ناشتہ کرا دیتیں۔ پھر ابا اسکول پہنچا دیتے۔

امی : اب سو بھی جایئے۔ تھوڑی دیر تو سو لیجیے۔

ابا : کتنا جی چاہتا ہے۔ میں بھی بچوں کو صبح صبح اسکول بس تک چھوڑ آؤں۔ کتنے دن ہو گئے۔ دو مہینے کم نہیں ہوتے۔ اکیلے چلے جاتے ہیں دونوں۔

امی : اب ایسے نا سمجھ بھی نہیں، پھر فاصلہ ہی کتنا ہے۔

ابا : اوہ ہوں...... وہ تو ٹھیک ہے مگر اور بچے بھی تو اپنے باپ یا ماں، کسی کے ساتھ آتے ہوں گے۔ لل...... لیکن تم بھی میری وجہ سے...... میری وجہ سے تم بھی نہیں جاتیں۔ تمہیں میری فکر لگی رہتی ہے۔

امی : اتنا نہ سوچئے آپ۔ آپ ٹھیک ہو جایئے، پھر آپ ہی اُنہیں بس تک چھوڑنے کے لیے چلے جایا کیجیے گا۔

ابا : روزانہ؟ (ہنس کر) یا ایسا کریں گے کہ ایک روز میں جاؤں، ایک روز تم! ہے نا؟

امی : (کچھ سوچتے ہوئے) جی...... ٹھیک ہے۔ آپ جیسا چاہیں گے۔

ابا : میں تو چاہتا ہوں کہ آج ہی انہیں لے کر جاؤں۔ لیکن...... (وقفہ) آہ...... آہ...... (کراہتے ہیں)

امی : (گھبرا کر) کیا پھر دَرد شروع ہو گیا؟

ابا : (دِھیرے سے) دَرد ختم ہی کب ہوا تھا؟ (گھنٹی بجتی ہے) دیکھو تو! شاید اخبار والا ہو۔

امی : جی نہیں...... اخبار والا تو چپ چاپ اخبار پھینک کر چلا جاتا ہے۔ پھر ابھی تو چھ بھی نہیں بجے، دُودھ والی بھی نہ ہوگی...... کوئی اور ہے شاید...... میں دیکھتی ہوں (جاتی ہیں، دروازہ کھلتا ہے۔)

(ذرا فاصلے سے آتی ہوئی آوازیں)

امی : ارے نجمہ تم ہو!

چچی : جی باجی......

امی : میں تو سمجھتی تھی کہ دِن میں کسی ٹرین سے آوَ گی تم۔

چچی : سفر میں کیا دن اور کیا رات...... آنا تھا، سو چلے آئے۔

امی : آوَ...... سامان تو اندر رکھوا دیں۔

چچی : سامان کیا......؟ بس یہی ایک سوٹ کیس ہے اور وہ ڈلیہ۔ چلئے میں لاتی ہوں (قدموں کی چاپ)

ابا : کون ہے؟ نجمہ ہے؟

چچی : آداب دولہا بھائی!

ابا : ارے...... تم اچانک کیسے؟ اور اکیلے آئی ہو کیا؟

چچی : باجی کا خط ملا۔ اُسی وقت روانہ ہوگئی۔ سیدھا سفر ہے۔ انہوں نے گاڑی پر بٹھا دیا تھا۔ میرے پڑوس کے وہ میر صاحب ہیں نا...... میر سرفراز حسین...... ان کے گھر والے بھی آرہے تھے۔ راستے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

ابا : پھر بھی کم سے کم اطلاع تو دے دی ہوتی...... ہم کسی کو اسٹیشن تو بھیج دیتے۔

چچی : مجبوری تھی دولہا بھائی۔ وہ بھی ساتھ آئے ہوتے لیکن اچانک ایسی مصروفیت آپڑی...... کل تک وہ بھی آجائیں گے۔ ہم چاہتے تھے کہ جلدی پہنچ جائیں۔ وہ نہیں آئے تو میں اکیلی ہی آگئی۔

ابا : (ٹھہر ٹھہر کر) تو کیا...... واقعی...... بہت جلدی تھی؟ بہت کم، بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ (حزنیہ موسیقی) اتنی جلدی کی تم نے تا کہ...... تا کہ مجھے......

امی : (رو پڑتی ہیں) خدا کے لیے دل میں وہم نہ لائیے۔

چچی : (جذباتی ہو کر) باجی...... (خود بھی رونے لگتی ہیں)

[موسیقی............ منظر بدلتا ہے]

نسیمہ : (اپنے آپ سے) شام...... شام جو دُشمن ہے۔ ظالم شام...... تیری کوکھ میں صرف راتیں چھپی ہوئی ہیں اور ہر رات کا سلسلہ دُوسری رات سے، ہر شام کا سلسلہ دُوسری شام ملا ہوا ہے۔ اندھیرا...... اندھیرا...... اندھیرا۔ (موسیقی کا ارتعاش) ہر طرف اندھیرے کی چاپ، ہونہہ...... اس رات کے بعد صبح پھر کہاں آئی...... پھول، پرندے، سورج، درختوں کے گھنے سائے...... کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اندھیرے نے سب کچھ چھپا دیا...... سب کچھ...... (بہتے ہوئے پانی کا تاثر) وہ کہتے ہیں ہر رات کا خاتمہ صبح پر ہوتا ہے۔ لیکن بزدل سورج! ابھی پل دو پل میں آگ کا یہ گولہ مرجھا کے گر پڑے گا اور کھو جائے گا۔ اندھی اتھاہ تاریکی میں (قدموں کی چاپ)

اشرف : میں آجاؤں نسیمہ؟

نسیمہ : کون؟ اشرف............!

اشرف : معاف کرنا نسیمہ۔ میں مخل تو نہیں ہوا تمہاری تنہائی میں؟

نسیمہ : (اُداسی سے) نہیں۔

اشرف : تم کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔ یہاں تو صرف تم ہو۔

نسیمہ : اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی (وقفہ...... بہتے ہوئے پانی کا تاثر)

اشرف : پھر میرا بیٹھنا تمہیں ناگوار تو نہیں ہوگا۔

نسیمہ : نہیں۔

اشرف : دیکھو...... کیسا دل فریب منظر ہے۔ سورج...... دِن بھر کا تھکا ہارا سورج اپنے غار میں چھپ گیا۔ یہ سفر کل صبح پھر شروع ہوگا۔

نسیمہ : (حیرت سے) کل...... کل...... آج کے بعد کیا کل بھی آئے گا؟

اشرف : (حیرت سے) نسیمہ!

نسیمہ : آج کا سلسلہ...... چار طرف بس ایک ہی سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ وہی تھکی تھکی سی آنکھیں اور بجھے ہوئے منظر...... پرچھائیں...... صرف پرچھائیں...... اس کھڑکی سے آسمان کا ایک چوکور ٹکڑا نظر آتا تھا اور بس...... کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا پرندہ۔ آنکھیں اس کا تعاقب کرنا چاہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ نیلے آسمانوں کی وسعت اور بے کرانی کو آنکھ کے تل میں سمیٹ لیں مگر...... (رُک جاتی ہے)

اشرف : مگر کیا؟

نسیمہ : (نسیمہ کی درد بھری ہنسی) چھوڑو بھی...... جانے دو۔

اشرف : نسیمہ...... تم رُک کیوں گئیں؟ (وقفہ)

نسیمہ : اس لیے کہ وہ آنکھیں رُک گئیں اور جب آنکھیں ٹھہر جاتی ہیں تو دُنیا ٹھہر جاتی ہے۔ وقت ٹھہر جاتا ہے۔ ان کا مقدر صرف رات تھی۔ اُنہیں تو یہ خبر بھی نہ ہوئی کہ اس رات کے ماتھے پر کوئی چاند بھی روشن ہے اور ستارے...... جہاں تہاں بکھرے ہوں گے...... مگر آسمان کا وہ ٹکڑا ایک دم خالی تھا۔

اشرف : نسیمہ!

نسیمہ : میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے اظہارِ ہمدردی کرنا چاہتے ہو۔ لیکن مجھے...... مجھے...... ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ کوئی بھی ہمدردی اِن آنکھوں کی محرومی کا علاج نہ بن سکی۔ کون ستاروں کو چھو سکتا ہے؟ کوئی نہیں۔ ایک کی آنکھ کا منظر کسی دُوسرے کا سرمایہ ہونے سے رہا۔

اشرف : (رُک رُک کر) نسیمہ...... دیر ہوگئی...... دیکھو اندھیرا گہرا ہوتا جاتا ہے!

نسیمہ : وہی تو میں بھی کہتی ہوں۔

اشرف : چلو گھر چلیں...... چچی انتظار کر رہی ہوں گی۔

نسیمہ : اشرف!

اشرف : (کچھ سوچتے ہوئے) ہوں!

نسیمہ : کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ابھی کچھ دیر اور بیٹھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم دُوسروں کی مرضی کے اتنے پابند کیوں ہیں؟

اشرف : اس لیے کہ...... اس لیے کہ دُوسروں کا بھی کچھ اختیار ہوتا ہے ہم پر۔ تم...... تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ......

نسیمہ : (جلدی سے) دیکھو! اَب ایسی باتیں نہ کرو کہ مجھے ہنسی آجائے۔

اشرف : تم ہنسنے سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟

نسیمہ : پھر؟

اشرف : پھر کیا...... ہم اگر دُوسروں کا درد بانٹ بھی لیں تو اس سے کیا حاصل؟

نسیمہ : ہم اپنی خوشیاں تو کسی کو دے نہیں سکتے...... اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر...... تو پھر بند ہونے سے پہلے اِن آنکھوں میں اِتنی محرومی کیوں سمٹ آتی۔

اشرف : (جذباتی ہوکر) بھول جاؤ نسیمہ۔ زندہ رہنے کے لیے بھولنا بھی ضروری ہے۔ جب تک تم کچھ بھولوگی نہیں، ذہن میں اِتنی گنجائش کیسے پیدا ہوگی کہ کچھ اور یاد کر سکو۔

نسیمہ : (بے تحاشہ ہنستی ہے)

اشرف : (حیرت سے) نسیمہ!

نسیمہ : (ہنستے ہوئے) تم سمجھتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ انسان کا ذہن بھی کوئی اسٹور رُوم ہے کہ پُرانا کاٹھ کباڑ نکال کر اس کی جگہ نیا سامان بھر دیا جائے۔

اشرف : بات بظاہر بھونڈی سہی لیکن واقعہ یہی ہے نسیمہ۔

نسیمہ : (ہنستی ہے) تو پھر...... پھر اس کی صورت کیا ہوگی! مجھے تو اپنے ذہن کے اسٹور

رُوم میں (ہنستی ہے) کوئی شئے...... کوئی رنگ...... ایسا دِکھائی نہیں دیتا جس کو
میں بیکار سمجھ کر الگ کر دوں اور اگر...... ایسا کرنا بھی چاہوں تو یہ ہوگا کیسے؟

اشرف : اس طرح کہ تم اپنے کمرے سے، اپنے آپ سے باہر نکلو۔ تمہیں کچھ پتہ
ہے، سورج ہر روز نکلتا ہے اور دُھوپ پھیلتی ہے اور پھولوں کے رنگ روشن
ہوتے ہیں اور بچے اسکول جانے کے لیے اپنے بیگ اُٹھائے اپنی ماں یا باپ
یا بھائی یا بہن کی اُنگلی پکڑ کر گھر سے نکلتے ہیں اور...... (لرزہ خیز موسیقی)

نسیمہ : (چیخ کر) اشرف...... اش...... رف! (موسیقی کی ایک لہر)

اشرف : (حیرت سے) کیا ہوا؟ کیا ہوا نسیمہ! نسیمہ!

نسیمہ : (بھرائی ہوئی آواز) اوہ...... اشرف...... میرے خدا...... تت...... تم یہ
سب...... یہ سب...... یہ سب!

اشرف : (جھنجھوڑتے ہوئے) نسیمہ...... نسیمہ......

[موسیقی............ منظر بدلتا ہے]

ابا : (ہانپتے ہوئے) بیگم...... بیگم...... اور کون ہے یہاں؟

چچی : یہ میں ہوں دولہا بھائی!

ابا : نجمہ...... اچھا ہوا تم آگئیں نجمہ...... تم سمجھ گئی تھیں نا کہ...... (ہانپنے لگتے ہیں)

امی : خدا کے لیے خود کو سنبھالیے۔ اتنا مت گھبرایئے کہ میرا دل ڈوب جائے۔

ابا : دل...... دل تو میرا...... ڈوب رہا ہے...... ڈوب رہا ہے۔ یہ کیا گرا تھا ابھی
فرش پر؟

امی : دیکھتی ہوں...... ابھی دیکھتی ہوں میں! شاید اماں کی تصویر تھی!

ابا : اماں مرحومہ کی (سانس تیز تیز چلنے لگتی ہے) ذرا دیکھو تو...... تصویر پر
خراشیں تو نہیں آگئیں...... اور کل رات...... کل رات ابا کی تصویر بھی اسی
طرح گری تھی نا!

امی : وہ میں نے سنبھال کر رکھ دی ہے۔

ابا : اماں کی تصویر بھی سنبھال کر رکھ دو...... کہ جب کبھی بچوں کو......

امی : (رونے لگتی ہیں)

چچی : (گھبرا کر) باجی...... باجی بیگم......

ابا : (ہانپتے ہوئے) یہ تم کیوں رونے لگیں (وقفہ) میں تو...... میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ تصویریں سنبھال کر رکھ دو۔ بچے سو رہے ہیں۔

امی : جی۔

ابا : کب تک سوتے رہیں گے۔ (ہوا کا شور)

امی : ابھی رات بہت باقی ہے...... ابھی...... ابھی تو صرف دو بجے ہیں۔

ابا : دو بجے ہیں۔ اسکول سے بچے دو بجے تک لوٹ آتے ہیں نا؟

امی : جی، دن کے دو بجے تک۔

ابا : دن کے دو بجے...... ہونہہ (مضمحل سی ہنسی) مجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں چلتا...... دن کے بھی دو بجتے ہیں...... اماں مرحومہ بتاتی تھیں کہ ہمارے اسکول میں بھی اسی وقت چھٹی ہوتی تھی۔ ابا خود تو دفتر سے نہیں آسکتے تھے، اس لیے اماں ہی لینے آتی تھیں ہمیں۔

امی : آپ پریشان نہ ہوئیے۔ میں انہیں بس تک چھوڑ بھی آؤں گی...... اور انہیں لینے بھی جاؤں گی۔

ابا : (بجھی ہوئی ہنسی) ہوں...... ٹھیک ہے۔ تم ہی جانا، تمہیں ہی جانا پڑے گا...... اماں مرحومہ...... بہت دنوں تک...... بہت دنوں تک وہی جاتی رہیں (ہانپنے لگتے ہیں)

چچی : آپ ذرا کم بولیے دولہا بھائی۔ زیادہ بولنے سے تھکن آتی ہے نا......

ابا : تو پھر تم ہی دونوں کچھ باتیں کرو۔

چچی : جی؟

ابا : بچوں کی باتیں کرو کچھ دیر۔

امی : بچے سو رہے ہیں۔ رات نو بجے تک ہوم ورک کرتے رہے، پھر سو گئے۔

ابا : تم میرے پاس کیوں نہیں لاتیں اُنہیں۔ آج تو میں نے اُنہیں دیکھا بھی نہیں۔

امی : آئے تو تھے۔ آپ کی آنکھ لگ گئی تھی اُس وقت۔

ابا : ہونہہ...... (ہنس کر) کتنی عجیب بات ہے۔ سب ساتھ جاگ رہے ہوں اور سب ساتھ ساتھ......

امی : (رونے لگتی ہیں)

ابا : (وقفہ) لو اب ہم چپ ہو جاتے ہیں۔ کریں بھی کیا...... ہم کچھ بھی کہتے رہیں تم خدا جانے کیا سمجھنے لگتی ہو۔ (ہوا کا شور) رات بھی بہت پانی تھا۔ اس وقت بھی بہت تیز بارش...... پیڑ تو بالکل بھیگ گئے ہوں گے۔ کیوں؟

چچی : اب دھیمی ہو رہی ہے بارش...... دولہا بھائی...... دس پندرہ منٹ میں شاید صاف ہو جائے آسمان۔

ابا : آج چاند کی کون سی تاریخ ہے؟

امی : گیارہویں......

ابا : تب تو چاند بڑا ہو رہا ہوگا...... دیکھو...... چاند دکھائی دیا؟

امی : ابھی تو بادل ہیں۔

ابا : میں نے...... میں نے کتنے دنوں سے نہ چاند دیکھا، نہ ستارے، نہ پھول...... صبح کو امرود کے پیڑ پر گوریاں تو آتی ہوں گی۔ کیوں؟

امی : جی، آتی ہیں۔

ابا : اور طوطے؟

امی : طوطے بھی آتے ہیں۔

ابا : پھل بھی کترتے ہوں گے! پتے بھی، کیوں؟ بچے امرود توڑتے ہیں؟

امی : جی!

ابا : اچھا...... کل اسکول سے آئیں تو کہنا کہ امرود توڑ کر مجھے دِکھائیں...... کل...... (پُرخیال انداز میں) لیکن کیا پتہ کل ہو...... کہ نہ ہو۔

امی : (رونے لگتی ہیں)

چچی : باجی...... باجی!

ابا : بس آج کا سلسلہ ہے سب کچھ! مجھے تو کچھ بھی، کچھ بھی فرق نہیں لگتا۔ ایک رات سے دُوسری رات، پھر تیسری، پھر چوتھی، پھر پانچویں...... رات کبھی ختم نہیں ہوتی...... نہ ہوگی...... رات...... کے قصے...... اسی طرح...... (موسیقی کا ارتعاش) یہاں آؤ...... ادھر آؤ بیگم! (سسکیاں) ذرا...... بچوں کو...... بچوں کو جگا دو...... میں اُنہیں...... اُنہیں ایک بار تو دیکھ...... لوں......۔

[لرزہ خیز موسیقی............ منظر بدلتا ہے]

ایک آواز : (بازگشت کے ساتھ) اندھیرا...... اندھیرا تمہارے اندر ہے۔ اندھیرا تمہارے اندر ہے۔ اندھیرا...... تمہارے اندر ہے۔ (چیخ) اندھیرا۔ (بازگشت) تمہارے اندر ہے۔ (موسیقی) اندھیرا تمہارے اندر ہے۔ (چیخ) (دروازے کھلتے ہیں۔ بھاگتے ہوئے قدم...... کوئی دروازہ پیٹتا ہے۔)

اختر : (باہر سے) نسیمہ...... نسیمہ!!

چچی : بیٹی...... نسیمہ...... میری جان۔ (دروازہ کھلتا ہے، نسیمہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر نکلتی ہے۔)

نسیمہ : بھائی جان! (لپٹ جاتی ہے اور روتی ہے۔)

چچی : بیٹی...... کیا ہوا بیٹی...... خواب دیکھ رہی تھیں کیا؟

نسیمہ : (ہانپتے ہوئے) خواب...... وہ سب شاید خواب ہی تھا چچی امی!

اختر : چپ ہو جاؤ بٹو! چپ ہو جاؤ۔ کتنا سمجھاتا ہوں کہ خواب دیکھنے کی عادت

چھوڑو، لیکن تم ہو کہ جاگتی آنکھوں سے بھی......

چچی : دیکھو وہی ہوا نا...... میں کتنا کہتی ہوں کہ میرے کمرے میں سویا کرو۔ آج ڈر گئی نہ بچی!

نسیمہ : چچی امی! (رونے لگتی ہے)

چچی : مت رو میری بچی، مت رو۔ دیکھو! میں کتنی پریشان ہو جاتی ہوں۔

اختر : اب چلو۔ چچی امی کے کمرے میں...... اور وہیں سو جاؤ۔

نسیمہ : (حیرت سے) سو جاؤں؟

اختر : پھر کیا جاگتی رہو گی یوں ہی؟ چلو۔ (وقفہ)

نسیمہ : کیا یہ نہیں ہو سکتا بھائی جان کہ میں......

اختر : (جلدی سے) نہیں...... اچھا چچی امی...... میں اپنا بستر اسی کمرے میں لگائے لیتا ہوں۔ آپ آرام کیجیے۔

چچی : لیکن بیٹے...... یہ سہمی کیوں...... نسیمہ......!

نسیمہ : جی چچی امی!

چچی : اب تو نہیں ڈرو گی؟

نسیمہ : جی نہیں...... مم...... میں تو کہتی ہوں کہ بھائی جان بھی...... آخر کیا ضرورت ہے؟ میں شاید یوں ہی ڈر گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں......؟

اختر : میں اپنا بستر لاتا ہوں۔ (جاتا ہے...... (وقفہ)...... آتا ہے) آپ جایئے چچی امی! کوئی خاص بات نہیں۔ یوں ہی ڈر گئی ہو گی...... بزدل کہیں کی۔

چچی : ذرا دم تو کر دوں اپنی بچی کو...... اور...... حمائل شریف لا کر رکھے دیتی ہوں سرہانے۔ (جاتی ہیں۔)

اختر : (کمرے میں بستر بچھاتے ہوئے) اب تم نے نیند خراب کی تو دونوں کان جڑ سے اُکھاڑ دوں گا۔

نسیمہ : (اُداس لہجے میں) بھائی جان۔

اختر : یوں تو بڑی عالم فاضل بنتی ہو لیکن دل بالکل چوہیوں جیسا...... ہزار بار سمجھا چکا کہ اتنا نہ سوچو...... اتنا نہ سوچا کرو۔ کہیں سوچنے سے بھی کچھ بدلتا ہے؟

نسیمہ : میں بچّی نہیں ہوں بھائی جان۔

اختر : پھر کون سی بڑی بوڑھی ہو! باتیں تو تم بچوں ہی جیسی کرتی ہو۔

نسیمہ : ہمارا اختیار کب ہے کہ نہ سوچیں۔ کیسے ممکن ہے کہ نہ سوچیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟

اختر : ہو کیوں نہیں سکتا؟ (چچی آتی ہیں)

چچی : یہ لو سرہانے رکھ لو حمائل شریف...... اللہ ساری بلاؤں سے تمہیں محفوظ رکھے بیٹی۔ اختر، اب تم بھی سو جاؤ۔ میں جاتی ہوں۔ اچھا، خدا حافظ! (جاتی ہے)

اختر : اب چپ چاپ آنکھ بند کر کے سو جاؤ۔ نیند نہ آ رہی ہو تو کوئی کتاب اُٹھا لو۔

نسیمہ : کتاب...... کتاب سے کیا ہوتا ہے۔ ذہن کچھ اور سوچ رہا ہو تو آنکھیں ٹھہر جاتی ہیں۔

اختر : بند کر لو آنکھیں اور سو جاؤ۔

نسیمہ : تو کیا تم سمجھتے ہو کہ بند آنکھیں کچھ دیکھ نہیں سکتیں۔

اختر : (زِچ ہو کر) افوہ...... تم تو بالکل بقراط ہو...... اب بحث بند کرو اور چپ چاپ لیٹ جاؤ۔ سمجھیں!

[موسیقی.......... منظر بدلتا ہے]

اشرف : نسیمہ!

نسیمہ : (کمزور آواز میں) جی!

اشرف : (سگریٹ سلگاتا ہے) ہوں...... لاؤ...... دُوسرا ورق لاؤ۔

نسیمہ : (دوسرا ورق بڑھاتی ہے۔ کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ)

اشرف : (ہنستا ہے) تم ایک دائرے کی قیدی ہو۔ تم سمجھتی ہو کہ زندگی ہر لمحہ...... ہر

پل...... بس خود کو دوہراتی رہتی ہے۔ تم نے لکھا ہے...... جانے والے اپنا تجربہ دوسروں کو سونپ جاتے ہیں۔ آخر کیا مطلب ہے تمہارا؟

نسیمہ : (وقفہ) ایسا نہیں ہوسکتا اشرف کہ سب ایک ساتھ اگلے سفر پر جاتے، پھر یہ راستہ کتنا سہل ہو جاتا! لوگ تو چلے جاتے ہیں اور یہ بھی نہیں سوچتے کہ اُن کے بعد دوسروں کا سفر کتنا مشکل ہو جاتا ہے......ان کے بغیر......

اشرف : خیر! اب روشنی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے بقیہ باتیں کل ہوں گی۔

نسیمہ : کل؟

اشرف : ہاں......کل صبح...... میں آؤں گا۔

نسیمہ : صبح!

اشرف : ہاں...... ہاں...... کل صبح! اور کل ہی یہ دوسرا ورق بھی پڑھیں گے۔

نسیمہ : تم ہنسی اُڑاتے ہوگے دل ہی دل میں...... کیوں؟

اشرف : کس بات پر؟

نسیمہ : کہ یہ سب بے وقوفی کی باتیں ہیں۔ ہے نا!

اشرف : کاش تم بھی یہی سمجھنے لگتیں...... (ہنستا ہے) اصل میں اگر ہم دوسروں کو سمجھنا چاہیں تو اس کا سب سے مناسب طریقہ یہی ہے کہ انہیں اپنی باتیں کہنے دیں۔ میں تمہارا شکرگزار ہوں کہ تم نے مجھ پر اتنا اعتماد تو کیا۔ (ہنس کر) تھینک یو مادام۔

نسیمہ : کروں بھی کیا؟ اب میں نے یہ اچھا مشغلہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ کل میں کشوَر ناہید کی کتاب پڑھ رہی تھی۔ لکھا تھا...... ''شاعری اس لیے کرتی ہوں کہ میں نے خودکشی نہیں کی۔''

اشرف : کتنا آسان ہے موت کو ٹالنا...... کیوں؟

نسیمہ : آسان تو نہیں ہے۔ اگر اتنا ہی آسان ہوتا تو ابا......

اشرف : رُک کیوں گئیں؟

نسیمہ : اماں مرحومہ بتاتی تھیں کہ اس رات ایک پل کے لیے بھی ابا کی آنکھ نہیں لگی۔ انہوں نے آخری بات اماں سے یہ کہی تھی کہ دوسرے دن ہم اسکول سے لوٹیں تو باغ سے امرود توڑیں اور پھر انہیں دکھائیں۔ مگر...... وہ اُن پھولوں کو دیکھنا چاہتے تھے جن کے پودے خود اُن ہی نے لگائے تھے۔ اُس رات...... ایک پل کے لیے بھی چاند نہیں چمکا۔ گیارہویں کی رات تھی اور رات...... بہت اندھیری تھی۔

اشرف : یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ چاند تو صرف اماوس کی رات غائب رہتا ہے۔ گیارہویں کو تو خاصا بڑا......

نسیمہ : لیکن امی تو یہی کہتی تھیں۔ بہت بادل تھے آسمان پر۔

اشرف : تو پھر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ چاند نہیں چمکا؟ چاند بھی تھا اور ستارے بھی...... بادلوں نے ڈھک لیا تھا اُنہیں۔ یہی تو میں تم سے کہتا ہوں۔ تم اپنے کمرے میں بند ہوتی ہو تو یہ سمجھتی ہو کہ باہر بھی کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ زندگی تو اپنی چال چلتی رہتی ہے نسیمہ بی بی۔

نسیمہ : (طنز سے) اوفوہ...... تم کس قدر انٹلیکچول باتیں کر رہے ہو! (ہنستی ہے)

اشرف : مجھے پتہ ہے۔ تم انہیں بے وقوفی کی باتیں سمجھتی ہو۔ لیکن زندہ رہنے کے لیے صرف سوچنا کافی نہیں ہوتا۔ زندگی تو ان ہی سیدھی سادی سچائیوں کی ڈگر پر چلتی رہتی ہے۔ لوگ مرتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں، کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ مرتے نہیں۔ پھر بھی ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے دُور ہو جاتے ہیں۔ کسی معمولی سی غلط فہمی یا بدگمانی کے سبب...... لیکن ایسا تو نہیں کہ چند لوگوں سے بچھڑ کر ہم خود کو ہمیشہ کے لیے تنہا سمجھ بیٹھیں۔

[پاس کے مندر میں گجر بجتے ہیں۔ نسیمہ کچھ سوچتی رہتی ہے]

نسیمہ : (پُر خیال انداز میں) ہوں۔

اشرف : تم سن رہی ہو یہ آوازیں...... کتنے کانوں تک یہ آوازیں پہنچی ہوں گی۔ ان

میں بہت لوگ اب نہ ہوں گے، مگر! ان کی جگہ کچھ اور آ گئے...... آگے کچھ اور آئیں گے۔

نسیمہ : (اُسی انداز میں) ہوں۔

[مندر کی گھنٹیاں لگاتار بج رہی ہیں۔]

اشرف : اب مجھے دیکھو۔ کون ہے میرے گھر میں؟ کوئی نہیں! ابی، امی، دونوں رُخصت ہو چکے۔ کوئی بھائی نہیں، کوئی بہن نہیں۔ میں تو اب اس گھر میں قدم رکھتا ہوں تو سہم جاتا ہوں۔ سارا سامان میں نے دو کمروں میں بھر دیا ہے۔ ابی کے ایک خاندانی ملازم تھے چھنگو میاں۔ اُن ہی کا خاندان اب اس گھر میں بسا ہوا ہے۔ سال چھ مہینے پر ایک آدھ روز کے لیے چلا جاتا ہوں۔ (اچانک کچھ کہتے کہتے رُک جاتا ہے۔)

نسیمہ : (اُسی انداز میں) تم رُک کیوں گئے؟ (مندر کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔)

اشرف : مجھے تو ابی اور امی کی قبروں پر لگے ہوئے کتبوں میں اور اس گھر میں اب کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ایسا نہیں ہے کہ میں اُنہیں یاد نہیں کرتا۔ بہت یاد آتی ہے اُن کی، مگر......

نسیمہ : مگر کیا......؟

اشرف : مگر خالی یاد کرنے سے ہوتا کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ یادیں اچھی ہوں یا بُری...... ہمیشہ دُکھ دیتی ہیں۔ اب میں صبح سے شام تک، کلینک میں کام کرتا ہوں۔ مصروف رہتا ہوں...... کتنے مریضوں نے میری گود میں دم توڑا ہوگا۔ اب تو میں شمار بھی نہیں کر سکتا اُن کا۔ ان میں بچے بھی تھے...... جوان بھی...... بوڑھے بھی......

نسیمہ : ہوں۔ (مندر کی گھنٹیاں)

اشرف : کتنے گھر اُجڑے مگر زندگی تو اسی طرح آباد ہے نا! بچے، پھول، ستارے، چاند، سورج، سبھی تو اپنی اپنی جگہ ہیں۔

نسیمہ : (پُرخیال انداز میں) سورج...... سورج تو ڈوب چکا۔ اب رات ہے۔

اشرف : ذرا اس پتھر کو سامنے سے ہٹا کر تو دیکھو۔ سورج ڈوبا نہیں، اس کالے مہیب پتھر کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ چلو اُٹھو...... اب چلتے ہیں۔ چچی اور اختر ہماری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔

نسیمہ : چلیں اب؟

اشرف : ہاں اُٹھو۔ (دونوں اُٹھتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں۔)

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

چچی : (باہر سے) نسیمہ بیٹی...... نسیمہ!

نسیمہ : (جمائی لے کر) چچی امی!

چچی : اُٹھو بیٹی۔ دروازہ کھولو...... اشرف آئے ہوئے ہیں۔ کتنی دیر ہوگئی۔ تم ابھی تک سو رہی ہو۔ (دروازہ کھولتی ہے)

نسیمہ : (بھرائی ہوئی آواز میں) اُف! کتنی تیز دھوپ ہے! کیا وقت ہوگا چچی امی۔

چچی : آٹھ بج چکے...... خیر! اتوار کا دن ہے۔ اختر اور اشرف دونوں ناشتے کی میز پر ہیں۔ بیٹی تم بھی جلدی سے تیار ہو کر آجاؤ۔

نسیمہ : (دھیرے سے) کیا ایسا نہیں ہو سکتا چچی امی کہ میں اکیلے ہی...... (قریب آتے ہوئے قدموں کی چاپ)

اشرف : نہیں...... ایسا نہیں ہو سکتا...... تمہیں ہمارے ساتھ چائے پینی ہے۔ سمجھیں!

نسیمہ : (دھیمے لہجے میں) اوہ! اشرف! بھائی جان کہاں ہیں؟

اشرف : وہ اخبار پڑھ رہا ہے۔ چچی امی...... آپ چائے لگوا دیجیے، میں نسیمہ کو لے کر آتا ہوں۔

چچی : اچھا بیٹے...... جلدی تیار ہو جاؤ بیٹی! میں چائے لگاتی ہوں۔ (چلی جاتی ہیں)

[وقفہ]

نسیمہ : رات میں خوب سوئی!

اشرف : خدا کا شکر ہے۔

نسیمہ : کھانے کے بعد نیند آنے لگی۔ مجھ سے کچھ لکھا بھی نہیں گیا۔

اشرف : یہ تو اور اچھا ہوا۔

نسیمہ : کیوں؟

اشرف : کہاں ہے وہ ورق جو کل پڑھنے سے رہ گیا تھا؟ (نسیمہ کتابیں پلٹ کر ورق نکالتی ہے اور اس کی طرف بڑھا دیتی ہے)

اشرف : (کاغذ کو چاک کرتے ہوئے) اب اس کی ضرورت نہیں نسیمہ! یہ کل کا ورق ہے۔ دیکھو...... آج دھوپ کتنی تیز ہے۔ جاؤ...... کم از کم آنکھیں تو دھو لو...... جلدی کرو۔

نسیمہ : (جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں) اشرف!

اشرف : نسیمہ!!

[اختتامیہ موسیقی]

○○

پانی پانی

پانی پانی

آوازیں :

بوڑھے، نوجوان، بچے، لڑکے، لڑکیاں، مرد، عورتیں، مشینیں، ہوا، پانی اور سکوت۔

زمانہ : حال

مقام : کرۂ ارض کا ایک ترقی پذیر علاقہ ...... مشرق!

ابتدائی موسیقی [ہواؤں کا شور...... سناٹا...... ہواؤں کا شور]

راوی : (دھیمے سروں میں دُور سے آتی ہوئی آواز)

پانی حد نظر تک پانی میری پیاس بجھائے کون
پانی حد نظر تک پانی میری پیاس بجھائے کون
پانی حد نظر تک پانی میری پیاس بجھائے کون
پانی...........
پانی...........
پانی........... (بہتے ہوئے پانی کا تاثر)

[فیڈ آوٹ]

[فیڈ اِن]

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ریسیور اُٹھتا ہے، ہلو ہلو کی جھنجھلائی ہوئی آواز...... ریسیور کریڈل پر پٹخنے کی آواز...... پھر ٹیلی گراف آپریٹر کی مسلسل ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، ٹک۔)

[ایک ثانیے کا وقفہ]

(ریڈیو آن ہوتا ہے۔ گھر ررررر گھر رررر کی آواز، سوئچ آف کر دیا جاتا ہے۔)

[ایک طویل قہقہہ.......... بازگشت]

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

راوی : (دُور سے) تو سنو لوگو!

[ایک ہجوم کا قہقہہ مداخلت کرتا ہے.......... قہقہہ.......... پھر قہقہہ]

راوی : (بھاری اور گرجدار آواز میں) لوگو! سنو! اپنے کانوں کے ساحل سے لگی ہوئی تمام اداس اور شادماں آوازوں کی کشتیاں، دریا کے بہاؤ کے ساتھ، آگے بڑھ جانے دو...... بادبان کھول دو...... چپوّ چلاؤ...... پانی، کبھی نہیں رُکتا...... بہاؤ تیز ہے۔ کشتیوں کو آگے بڑھ جانے دو۔ یہ تمام بے معنی اور بے جہت آوازیں خلاء کے سمندر میں ڈوب جائیں گی۔ پھر تم، اس آواز کے، جو تم سے مخاطب ہے، اُتار چڑھاؤ کی پرتوں میں چھپے ہوئے ہر رنگ کی پہچان کر سکو گے۔ سنو! بادبان کھول دو۔ کشتیوں کو آگے بڑھ جانے دو!

[قہقہہ]

راوی : لوگو! میں جو کچھ کہتا ہوں، اور تم...... جو سننا نہیں چاہتے، وہ سب، نقطہ نقطہ، حرف حرف، ہواؤں کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے۔ میں نے یہ تحریر آنکھوں سے دیکھی ہے اور لفظوں کے ملبے سے، آگہی نے، معنی چنے ہیں...... اور...... میرا دل، ان ہی لفظوں کے بوجھ سے نڈھال ہے، اور آنکھ اسی تحریر کے منظر سے بے حال ہے...... اے لوگو! اس تحریر میں کسی بات کا جواب نہیں، سب کا سب سوال ہے...... تو سنو!

[قہقہہ]

الف : تم مجھے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ میں کتنی بار تمہیں اپنی مجبوریاں بتا چکی ہوں۔ تم سمجھتے کیوں نہیں؟

بے : IT'S ALL RUBBISH.

جیم : رمیش! اور میش! اب سنتا کیوں نہیں؟

الف : میرے خدا! تم مجھے سمجھتے کیوں نہیں۔ مجھے آخر کب سمجھو گے؟ اسی طرح گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔ تم یہی کہتے رہو گے کہ بکواس کر رہی ہوں۔

دال : (سرگوشی میں) اور پھر...... میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ گلی کے نکڑ پر وہ ایک دُوسرے سے لپٹ گئے۔ پھر ایک نے دوسرے کے کان میں کچھ کہا، پھر دوسرے نے پہلے کے کان میں کچھ کہا۔ مجھے یقین ہے...... وہ بھاگنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ تم خود سن لینا۔ دو تین دن کے اندر اندر...... طوفان اُٹھنے والا ہے۔

ہے : (نسوانی آواز) ہائے ہائے...... دیکھ لیا نا اس جنم جلی کو۔ کم بخت کی آنکھوں سے بے حیائی برستی تھی۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ گل کھلائے گی۔ اُجاڑ، ابھاگی۔ پُرکھوں کے نام پر پانی پھیر دیا۔ چہرے پر دیکھو تو ڈھول اُڑتی ہے۔ سوکھی...... سڑی......

الف : میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ آج شام یہ ہو کے رہے گا۔

بے : میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ اب کے بجٹ......

جیم : ارے میں تو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اس الیکشن میں......

دال : اور میں نے کہا نہیں تھا...... گاڑی ابھی، ابھی لڑ جائے گی۔

ہے : مجھے تو پہلے ہی پتہ تھا کہ یہ کلموا باسی ترکاریاں اُٹھا لائے گا۔

الف : میں نے تو پہلے ہی............

بے : میں نے تو پہلے ہی............

جیم : میں نے تو پہلے ہی............

دال : میں نے تو پہلے ہی.........

ہے : میں نے تو پہلے ہی.........

(قہقہہ......... پھر قہقہہ......... پھر ایک اور قہقہہ)

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

(کلیسا کے گھنٹے...... ملے جلے نسوانی قہقہوں کے درمیان ایک بھاری مردانہ آواز)

In the beginning was the word
and the word was with god
and the word was god

راوی : تو سنو! لوگو!!

[ہجوم کی ہنسی]

راوی : (گھبرا کر) یہ کون بار بار آوازوں کی ہنسی اُڑاتا ہے؟

دوسرا راوی : ایک قہقہہ تو خاموشی نے لگایا تھا۔

راوی : کیا کہا؟ خاموشی؟

دوسرا راوی : ہاں، خاموشی۔ جو آواز سے زیادہ بامعنی ہے۔ خاموشی، جو لفظ کا باطن ہے اور ہر آواز کا آغاز......اور ہر آواز کا انجام بھی!

راوی : میری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔

دوسرا راوی : اور نہ آئیں گی! اسی لیے لفظ معنی سے محروم اور آواز جذبے سے عاری ہے۔ یہ سارے برتن خالی ہیں۔ یہ کھنکتے ہیں...... مگر پیاس نہیں بجھا سکتے۔

راوی : تو سنو لوگو! بادبان کھول دو! کشتیوں کو آگے بڑھ جانے دو! بہاؤ تیز ہے...... پانی کبھی نہیں رُکتا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ جب آسمانوں سے......

[کچھ آوازیں بیچ میں مداخلت کرتی ہیں]

الف : بکواس...... ایک دم بکواس...... مجھ سے اس کے پانچ صفحے بھی نہیں پڑھے گئے۔ اس احمق سے پوچھنا چاہیے، کیا کتابیں اسی لیے لکھی جاتی ہیں کہ پڑھی نہ جائیں؟

بے : لکھتا ہے...... ذاتی دُکھوں کی مثال اُس دیے کی ہوتی ہے جس کا اُجالا محدود ہے۔ اُس اُجالے میں وہی دِکھائی دے گا جو دیے کے پاس ہو۔ دُوسرے بس دُھند دیکھیں گے۔ دُوری ایک بھید ہے اور دیوار بھی۔

الف : بکواس! کوئی کسی کے دُکھ کو نہیں سمجھتا...... گدھے۔

بے : لکھتا ہے...... کوئی بھی ان دُکھوں کی تہہ تک نہیں پہنچتا۔ لوگ صرف ہنسی اُڑانا جانتے ہیں، یا پھر اپنی معاملہ فہمی اور دانشوری کی نمائش کرتے ہیں۔ فلسفے چھانٹتے ہیں، اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ وہ جس کے دل کا ہر گھاؤ رِس رہا ہو، اس سے بحث کرنا، اسے سمجھانا، اس کی توہین کرنا ہے۔ لوگ یہ بھی نہیں سمجھتے......

الف : (روک کر) چوپ راؤ...... بکواس...... ان کے دل اندھے ہیں، آنکھیں بہری......

بے : لوگ یہ بھی نہیں سمجھتے (بازگشت)
لوگ یہ بھی نہیں سمجھتے............
لوگ یہ بھی نہیں سمجھتے............
لوگ یہ بھی نہیں سمجھتے............

راوی : (ایک پل کی خاموشی کے بعد) لوگو! تم یاد کیوں نہیں کرتے کہ جب تم نے آگہی کے سمندر میں ہوس کے جہازوں پر سفر کا آغاز کیا تھا، اس وقت ہر جزیرے پر، اجنبی دُنیاؤں کے باشندے تمہارے خیر مقدم کے لیے کھڑے تھے۔ تم نے سفید فام عورتوں سے شادیاں کی تھیں اور سرخ و سفید بچے پیدا کیے تھے اور تم یہ بھول گئے کہ اس کرّے کے بعض حصوں پر آسمان نہیں، صرف

دُھوپ چمکتی ہے اور کالے سروں پر شعلوں کا سائبان ہے۔ ان علاقوں کی عورتیں بھی زرخیز تھیں اور انہوں نے سپاہیوں کی فصلیں کاٹی تھیں...... دیکھو لوگو...... کہ اب آسمان کی چھتری سمٹتی جا رہی ہے اور دُھوپ تیز ہے۔

[قہقہہ...... ملی جلی باتوں کا شور، پلیٹوں کی کھنک]

الف : (نسوانی آواز) کولڈ کافی۔

بے : (بچے کی آواز) ممی! میں کوک پیوں گا۔

جیم : (منحنی مردانہ آواز) اے! تم کیا جانو؟ اس کا بھید پانا مشکل ہے۔ اس دن میں نے جان بوجھ کر اسے نظر انداز کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ بات نہ سمجھ سکے گا...... مگر......

دال : (بھاری غصیلی آواز) ایماندار آدمی ہمیشہ مغرور ہوتا ہے۔ پھر بھی، اسے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اسے کتنی بار سمجھایا کہ عقیدے اور قدریں اور اقوال سب کتابوں کے لیے ہوتے ہیں۔ زندگی کے لیے نہیں۔ لوگ ان پر عمل کرنے لگیں تو لفظوں کا پیشہ کرنے والے کیا بھیک مانگیں گے؟ اکیڈمیاں، ادارے، علوم اور افکار کے اعلیٰ مراکز، یہ حرامزادے لفظوں کا پیشہ کرتے ہیں اور ان کی کمائی، بس یہ ہے، عہدے، مراتب، مناصب، نمائشیں لیکن اس نے یہ سب سمجھنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ احمق...... نفرتوں کو اپنی ہستی کی ڈھال بنا رکھا ہے...... اور تلوار اس کے پاس نہیں۔

ہے : (سرگوشی میں) یار، کیا بتاؤں، وہ سنگ مرمر کا بت تھی بت...... تمام قوس اور خطوط اور زاویے...... بس یہ سمجھ لو کہ الف لیلیٰ کی کہانی تھی...... ہر لفظ ایک شخص تھا، ہر مصرعہ ایک شہر...... گھومتے رہو...... نہ آبادی ختم ہوگی نہ طبیعت بھرے گی۔

واؤ : آرڈر پلیز!

راوی : (دُور سے...... دھیمے سروں میں)

پانی، حد نظر تک پانی — میری پیاس بجھائے کون
پانی، حد نظر تک پانی — میری پیاس بجھائے کون
پانی بھی پتھر جیسا ہے — پتھر سے ٹکرائے کون
پتھر سے ٹکرائے کون
پتھر سے ٹکرائے کون
پتھر سے ٹکرائے کون

[بہتے ہوئے پانی کا تاثر...... فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

(دروازے پر دستک)

الف : کون؟

بے : میں!

الف : تم؟

بے : ہاں!

[کرسی گھسٹنے کی آواز...... دروازہ کھلتا ہے]

الف : اوہ......تم ہو؟ میں سمجھا وہ ہے!

بے : نہیں...... یہ میں ہوں۔ مجھے غور سے دیکھو بے وقوف!

الف : بے وقوف تم ہو کہ ایک جیسی آوازوں میں فرق بھی نہیں کر سکتے۔

(بازگشت)

بے وقوف تم ہو
بے وقوف تم ہو
بے وقوف تم ہو............(وقفہ)

ب : تم کر کیا رہے تھے؟

الف : ایڈیٹوریل۔

ب : دیکھوں!

الف : کانوں سے دیکھو، میں پڑھتا ہوں۔

الف : (پڑھتا ہے) یہ کیسا جبر ہے کہ ہمارا احساس اور ہمارے تجربے لفظوں میں ڈھلتے ہیں تو کوئی سننے والا نہیں ملتا۔ سننے والا ملتا ہے تو سمجھتا نہیں۔ رشتوں کی یہ نوعیت ہمارے عہد کا المیہ ہے۔ وہ جذباتی بندھن جو دوستی، قرابت، محبت اور یگانگت کو بامعنی بناتے تھے، اب ٹوٹ چکے ہیں۔ زمین سمٹ گئی ہے۔ فاصلے بڑھ گئے ہیں۔ اس گنہگار معاشرے کی آنکھیں محرومیوں کا تماشہ دیکھ تو سکتی ہیں۔ لیکن انہیں بھیگنا نہیں آتا۔ مٹی پتھر بن گئی ہے اور پتھر اپنے وجود کا احساس تو دلاتے ہیں لیکن ان کی شریانیں، انسانی لہو کے رشتوں کی حرارت سے عادی ہیں۔ ان میں صرف آگ ہے...... آگ...... نفرت اور حسد کی آگ...... رقابت کی آگ...... ایک اندھی دوڑ میں دُوسروں سے آگے بڑھ جانے کے حیوانی جذبے کی آگ...... شہر جل رہے ہیں اور ہر آنکھ ریگ زار ہے۔ یہ آگ کب تک بجھے گی؟

ب : پانی اُبل گیا ہے۔ ہیٹر آف کر دو۔

الف : چائے، یا کافی؟

ب : کچھ بھی سہی...... سینے کو کچھ گرمی چاہیے۔

[برتنوں کی کھنک...... کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں]

الف : اینگری جنریشن کے پچھلے شمارے میں تم نے اس کا مضمون دیکھا؟

ب : کس کا؟

الف : اُس کا!

ب : ہاں۔

الف : اس نے گھوم پھر کر اپنے ہی حلقے کی باتیں کی ہیں۔ سالا! کولہو کا بیل! بس اپنے جیسے بیلوں کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔

بے : یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان کے تجربے ایک جیسے ہوں۔

الف : ہوگا! مگر اس چکر سے یہ نکلتے کیوں نہیں؟ اس نے جان بوجھ کر مجھے نظر انداز کیا ہے۔

بے : ان دنوں وہ اپنی ہی زنجیر میں اُلجھا ہوا ہے اور یہ زنجیر بہت لمبی ہے۔

الف : ہوگی! مرنے دو اس مردود کو!

بے : وہ واقعی مر رہا ہے۔ ایسی اُلجھنیں اپنے ہی لہو پر پلتی ہیں۔

الف : تو اس کے مرنے سے کون سی کمی آجائے گی؟

بے : کمی تو کسی کے مرنے سے نہیں آتی۔

راوی : دیکھو دیکھو! پانی اُبل رہا ہے۔

(قدموں کی چاپ، کھٹ پٹ کی آوازیں)

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

[ہوا کا شور...... سناٹا...... گھوڑوں کی ٹاپ، لحہ بہ لحہ دُور ہوتی ہوئی]

راوی : لوگو! وہ جب گھر سے چلے تھے، رات تھی۔ آج بھی رات ہے اور تھکے ہوئے کئی قافلے اس رات کی سیاہی میں گم ہو چکے ہیں۔ ساربانوں نے دیکھا کہ جب اُن کے اونٹ اور خچر اور گھوڑے روشنی کے محتاج ہیں، اور سفر لمبا ہے، تو اُنہوں نے چہروں سے اپنی آنکھیں نوچ لیں اور اَے لوگو! اُن آنکھوں کو پرانے صحیفوں کے طاق پر سجا دیا۔ پھر اُنہوں نے پتھروں میں شگاف کیے اور لوہے کو پگھلا کر اُسے اپنی آنکھوں کے غار میں، جو سانچوں کی مثال تھے،

پتلیوں کی طرح ڈھال لیا، کیونکہ رات لمبی تھی اور اُنہیں بہت دُور جانا تھا......
اور صور کی صدا بہت تیز تھی...... اور وہ بھول گئے کہ راتیں سونے کے لیے
ہوتی ہیں۔ پھر انہوں نے بے نام منزلوں کی تلاش کا فرض ان انجانے
راستوں کو سونپ دیا جو حلقہ در حلقہ، اُن کے چار طرف پھیلے ہوئے تھے اور
ان کا سرا آنکھوں سے اوجھل تھا۔ پھر اُنہوں نے سفر کی صعوبتوں کا جوا بھی
کاندھوں سے اُتار پھینکا اور ان کی پنڈلیاں سوکھتی گئیں کہ اب ان کے پاؤں
ساکت تھے، اور رفتار تیز تر تھی۔ سنو لوگو!

(پس منظر سے موٹر کے ہارن، انجن کی سیٹی، مل کا بھونپو اور مشینوں کی
گھڑگھڑاہٹ کا شور اس شور میں ڈوب جاتا ہے)

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

(مسلسل بڑھتے ہوئے قدموں کی گت پر مکالمہ)

الف : ابھی آسمان کے کنگورے روشن نہیں ہوئے؟

بے : نہیں! چلتے رہو۔

الف : مرغ کی بانگ بھی نہیں سنائی دی؟

بے : نہیں...... چلتے رہو۔

الف : مندروں کے گجر اور موذن کی پکار...... کچھ سنائی نہ دیا!

بے : نہیں...... چلتے رہو۔

الف : ستارے بھی تو دکھائی نہیں دیتے۔ یہ کیسا آسمان ہے؟

بے : ستارے تمہاری پلکوں میں ہیں۔ چلتے رہو۔

الف : زمین سخت ہے۔ ہم گردن تک ڈوب چکے ہیں۔

ب : چلتے رہو۔

الف : مگر ہم کہاں جا رہے ہیں؟

ب : بکو مت! چلتے رو۔

الف : ہم کیوں جا رہے ہیں؟

ب : ڈرو مت، چلتے رہو۔ ہمارے پاؤں کے تلووں سے لازوال آنکھوں کے قمقمے چپکے ہوئے ہیں۔

الف : کب سے...... ہم کب سے یوں ہی چلے جا رہے ہیں؟

ب : سوچو مت! سوال مت کرو! اب تم پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھ سکتے اور مڑے تو پتھر کے ہو جاؤ گے۔

الف : پتھر؟ سب پتھر! کل پتھر! آج پتھر! آج کا کل پتھر......

ب : ہاں! چلتے رہو۔ اپنے تیشے پھینک دو۔ سامنے کالی دُھوپ ہے اور آنکھوں کی چمنی سے اُبلتا ہوا دُھواں۔

الف : اور پتھروں کی بارش...... اُنہیں پھینکنے والا کون ہے؟

ب : یہ دیکھ لیا تو کہیں کے نہ رہو گے۔ گردن پر، ماتھے پر، سینے پر، جہاں کہیں آنکھ اُگی ہوئی ہو نوچ لو۔

الف : مگر پتھروں کی یہ بارش؟

ب : کہہ تو رہا ہوں...... یہ اُلٹی اُلجھی سمتوں کے سفر کا مقدر ہے۔ سامنے دیکھو...... بند آنکھوں سے...... اور چلتے رہو۔

الف : تم کیسے ہم سفر ہو کہ میری اُلجھن کو بھی نہیں سمجھتے!

ب : تمہاری اُلجھن تمہاری اُلجھن ہے۔ سفر ہم دونوں کا، چلتے رہو۔

(قہقہہ......... اُس کی گونج طویل ہوتی جاتی ہے)

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

راوی : بہاؤ تیز ہے۔ ساحلوں کی سمت نہ دیکھو لوگو! اب اُن ساعتوں کا ذکر نہ کرو جن کی کھڑکیاں بند ہو چکیں اور اُن امتوں کے حشر سے بچو جو اپنی حد سے گزر گئیں اور راستوں میں مر گئیں۔ دیکھو...... بہاؤ تیز ہے، ہواؤں کی پیشانی پر لکھی تحریر میں نے پڑھی ہے۔ اِسی لیے میں ہر ساحل سے، ہر جزیرے سے خائف ہوں اور یہی خوف ہماری قوت ہے جو ہمیں دانہ دانہ سمیٹ کر ایک کرتی ہے اور ہمیں متحرک رکھتی ہے، اور اے لوگو! ہم سے پہلے جو قافلے اس سفر پر نکلے تھے، اُن کی توانائی بے ثمر حوصلے تھے۔ لیکن اُن کا انجام تم جانتے ہو۔ تم اپنے شانوں سے کاسۂ سر اُتارو اور اُسے پیروں میں باندھ لو۔ پانی کبھی نہیں رُکتا۔

(پس منظر سے........... دھیمے ساز پر)

تمام رنگ ہوا تھے سراب تھا دریا
بجھی نہ پیاس کہ تصویرِ آب تھا دریا
رُکے جو پاؤں تو زنجیرِ جاں بھی ٹوٹ گئی
کسی صدائے سفر کا جواب تھا دریا
بہت عجیب کہانی تھی بہتے پانی کی
ورق ورق تھے سفینے کتاب تھا دریا
بجھی نہ پیاس کہ تصویرِ آب تھا دریا
کسی صدائے سفر کا جواب تھا دریا

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

(طوفانی، لرزہ خیز موسیقی، ہجوم کا شور، چیخیں، سسکیاں)

الف : (نسوانی آواز) تمام دروازے مقفل کر دو!

بے : (مردانہ آواز، سراسیمہ) ہجوم، اس طرف آ رہا ہے۔

الف : (بچے کی آواز) ممی ممی! آسمان پر دُھواں دیکھو! آپا!

الف : یا اللہ! ہمیں اپنی امان میں رکھ۔

ایک آواز : (دُور سے آتی ہوئی۔ بھاری اور خطیبانہ) اور جو لوگ ایمان کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑیں گے، وہ تمام آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ رہیں گے کہ اللہ اُن کا نگہبان ہے اور اُس کے رسولؐ نے ان کے تحفظ کی ضمانت دی ہے۔

(بیچ بیچ میں شور، چیخیں)

بے : وہ قریب، اور قریب آتے جا رہے ہیں۔ ہم سے بہت قریب۔

الف : ہم سب، ایک دُوسرے سے کتنی دُور ہیں؟

(شور...... دروازے ٹوٹتے ہیں)

آوازیں : (ملی جلی) مارو! مارو! اس لڑکی کو کیمپ میں لے چلو۔

ایک آواز : (نسوانی) مجھے چھوڑ دو...... درندو...... مجھے چھوڑ دو!

دوسری آواز : کھول دو!

تیسری آواز : ایں...... مشٹیک ہو گیا۔

چوتھی آواز : مسلمانو! جاگو۔ تم اس زمین پر اللہ کے نائب ہو۔

پانچویں آواز : Kill the Communist Dogs

چھٹیں آواز : ہم ایک ہیں...... ایک تھے...... ایک رہیں گے...... ہم سب کا خون ایک رنگ کا ہے...... ہم نے ایک ہی آکاش کے نیچے، ایک ہی دھرتی پر سانس لی ہے۔

کورس :

ایشور اللہ تیرو نام
سب کو سمتی دے بھگوان
سب کو سمتی دے بھگوان

سب کو سمتی دے بھگوان
سب کو ....

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

ساتویں آواز : (بوڑھی...... کہانی سناتی ہوئی) تو بچو! اس نے تمام لکڑیاں ایک ساتھ اُنہیں دیں اور کہا کہ اِنہیں ایک ساتھ توڑو۔ اُنہوں نے بہت طاقت لگائی، بہت لگائی...... لیکن...... اتفاق میں بڑی طاقت ہے۔

پہلی آواز : (ہچکیاں) ہم نہتے ہیں اور اکیلے ہیں۔ وہ ہزاروں میں ہیں۔

ساتویں آواز : تو بچو! اتفاق ہی میں طاقت ہے۔

پانچویں آواز : چھ دُکانیں جلا دی گئیں۔ محلے کے سارے گھر لٹ چکے۔ برہنہ عورتوں کا جلوس نکالا گیا۔

آٹھویں آواز : (قہقہہ) اتفاق میں بہت طاقت ہے۔ اتفاق سے بستیاں اُجڑ جاتی ہیں۔ اتفاق سے زمین پھٹ جاتی ہے اور اتفاق سے بچوں کے پیر پہیے کے نیچے آجاتے ہیں۔

(چیخیں........... قہقہہ)

[فیڈ آؤٹ]

راوی : جب اُنہوں نے زرخیز زمینوں پر اپنے ہاتھوں کی ٹہنیاں بوئیں، تو لوگو! بادل کہیں اور چلے گئے۔ پھر بستیوں میں اکال پڑا اور جانور مرنے لگے۔ پھر اُنہوں نے اپنے بیٹوں کے سر قلم کیے اور ان کے لہو سے اپنے ہونٹ تر کیے اور ان کی کھال سے چراغوں کے فانوس بنائے اور اپنے ہاتھوں پر مگر کی

کھال کے غلاف چڑھا لیے، کہ یہ ہاتھ، زرخیز زمینوں سے مس ہوں تو ہاتھوں کی گرمی ان تک نہ پہنچے اور زمینوں سے بھوک کی فصلیں نہ اُگیں......
اور لذت کا زہر ربر کی دیواروں سے رس نہ سکے۔
(ملی جلی آوازیں، ہنسی)

پہلی آواز : ارے! میں لائبریری کی طرف جا رہی ہوں۔

دُوسری آواز : چلو! کینٹین چلتے ہیں۔

پہلی آواز : مجھے نوٹس لینے ہیں، امتحان سر پر ہیں۔

دُوسری آواز : سر پر نہیں، پیروں میں ہے بیوقوف۔ حساب تو شہر کی سڑکوں پر چکانا ہوگا۔
(دُور سے شور کی آواز)

پہلی آواز : ارے! یہ شور کیسا ہے؟

دُوسری آواز : شور نہیں...... آوازوں کی سمفنی۔

پہلی آواز : سنو تو...... آخر بات کیا ہے؟

دُوسری آواز : ہڑتالیوں کا جلوس ہوگا۔

آوازیں : (ملی جلی آوازیں) اسٹوڈینٹس یونیٹی...... زندہ باد...... اسٹوڈینٹس یونیٹی...... زندہ باد۔

آوازیں : (ملی جلی) امار نام...... ویتنام۔

مقرر : آج کی بحث کا موضوع ہے...... تہذیب کے ارتقا میں تعلیمی اداروں کے رول کی اہمیت۔

دوسرا مقرر : ہمارا ادارہ اس دیوانے کا خواب ہے جس نے آج سے سو برس پہلے......

ایک آواز : (دھیرے سے) نہیں! اس نے یہ کام ہمارے لیے چھوڑ دیا تھا۔

تیسرا مقرر : اور جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، اب ان سانچوں کو بدلنے کی ضرورت ہے جن میں ڈگری یافتہ مجسمے ڈھالے جا رہے ہیں۔ یہ مجسمے ذرا سی دھوپ سے پگھل جاتے ہیں۔ سیاست کی دھوپ...... اختلاف کی دھوپ......

مفادات کی دھوپ...... تجارت کی یہ منڈیاں...... کب بند ہوں گی۔

ٹیچر : (کلاس روم میں) آزادی...... مساوات اور بھائی چارہ...... یہی تین اُصول تھے جنہوں نے اٹھارہویں صدی کے فرانس کو انقلاب کا راستہ دکھایا۔ روسو، والتیر اور آدم اسمتھ نے تاریخ کے اس موڑ پر، ایک نئے شعور کی اشاعت کی۔ یہ شعور انقلاب کا شعور تھا۔

دوسرا ٹیچر : مہاتما تلسی داس جی کہتے ہیں......

جو تو کو کانٹا بووے تا ہی بوئی تو پھول
تو کو پھول کے پھول ہیں واکو ہیں ترشول

ہے بالکو! پریم اور شانتی کی اس پرمپرا نے بھکتی کال کے کویوں کے یہاں ایک نئی مانوتا کی آدھار شلا رکھی۔ اس مانوتا کو کسی وشیش وشواس کی درشٹی سے نہیں بلکہ ایسے مولیوں کی درشٹی سے پرکھنا چاہیے، جو دھرم اور وشواس کی ویکتی گت دھاراؤں کی سیما میں نہیں سمیٹے جا سکتے۔ جن کی جیوتی اسیم اور اپار ہے۔

ایک آواز : ارے میں اسے خوب جانتا ہوں...... رٹو توتا!

دُوسری آوز : لیکن اسے فرسٹ کلاس تو مل گیا۔

پہلی آواز : پھر کیا ہوا؟ اتنی مکھن بازی؟

تیسری آواز : پانی پت کی پہلی لڑائی کن لوگوں میں ہوئی تھی؟

چوتھی آواز : رضیہ سلطانہ اور بابر میں۔

تیسری آواز : ایں...... کیا کہا؟

چوتھی آواز : اس میں حیرانی کیا ہے؟ ناموں پر نہ جاؤ۔ یہ تو طے ہے کہ لڑائی ہوئی تھی۔

پانچویں آواز : **اسپنگلر** کہتا ہے...... تاریخ ہمارے اجتماعی تجربے کا نہیں، انفرادی تجربوں کا ریکارڈ ہے اور آج ہم جنہیں تاریخ کے ہیرو کہتے ہیں، ان میں اکثر بدترین انسانی جرائم کے مرتکب ہوئے تھے۔ Criminals.....

چھٹیں آواز : When a criminal goes on the cross he resembles christ.

پانچویں آواز : ہاں! درے لگانے سے پہلے انہیں تختے سے باندھ دیا جاتا ہے۔ مگر ایک بات ہے کہ وہاں ڈاکٹر بھی ہوتا ہے اور مفتی بھی۔

ساتویں آواز : پاؤنڈ نے شخصی حکومت کی حمایت کی تھی اور جب ساری سیاسی جماعتیں کرپٹ ہو جائیں، پھر راستہ ہی کیا رہ جاتا ہے؟

آٹھویں آواز : لیکن اگر پاؤنڈ فاشسٹ ہونے کے بجائے خود کمیونسٹ ہوتا تو کیا اسے امریکہ کا بالنگن پرائز مل جاتا؟

ساتویں آواز : بکومت...... انفرادی آزادی اور ادب کے مسئلے کو سیاست میں کیوں اُلجھاتے ہو؟

آٹھویں آواز : سیاست کے مارے ہوئے تو وہ لوگ تھے جو انفرادی آزادی کے سب سے بڑے دعوے دار تھے۔

نویں آواز : ہم اپنے پڑوسیوں کا جیون جی رہے ہیں۔ یہی ہمارے دُکھ کا کارن ہے۔

دسویں آواز : (دُور سے)

America....... when will you send your eggs to India

America....... when will you put off your clothes

America...... when will you be naked

پہلی آواز : بال یوگیشور سے کسٹم والوں نے......

دوسری آواز : مجھے پتہ ہے۔ کوئی پانچ لاکھ روپے کا سامان تھا۔ ایک سوٹ کیس میں گھڑیاں بند تھیں۔

پہلی آواز : تم گھڑی کی سوئیوں کو اُلٹی طرف نہیں چلا سکتے۔ سمجھے!

تیسری آواز : (دُور سے) قناعت میں سکون ہے۔ صوفیا نے دُنیا کو پاؤں کی جوتی سمجھا اور نانِ شعیر کے اس لقمے کو بھی، حلق سے نیچے اُترنے نہ دیا، جو لذت

سے ہمکنار تھا۔ اے اللہ والو!

چوتھی آواز : (دُور سے) اپنی کامناؤں کے جال سے نکلو، پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ ہوا کتنی سہانی ہے اور پانی۔

پانچویں آواز : (کلاس روم سے) Minimisation of wants کی یہ تھیوری مغرب کے ماہرین اقتصادیات کے نزدیک مشرق کی روحانیت کا نتیجہ ہے اور......

چھٹیں آواز : (ریستوران میں) بوائے! مٹن کٹلٹس کی دو پلیٹیں......آملیٹ اور کافی۔

ساتویں آواز : (بچے کی) ممی! پانی!!

آٹھویں آواز : چکر لگا رہا ہوں۔ نوکری آسانی سے کب ملتی ہے۔

نویں آواز : یہ نیا ماڈل...... میں نے ابھی لیا ہے۔ کنزمپشن بہت ہے۔

دسویں آواز : چھوڑو بھی۔ قیمت پوچھ کر کیا کروگے۔ شوکیس بس دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔

گیارہویں آواز : (نسوانی) ذرا شاپنگ کے لیے جا رہی ہوں...... Fantastic...... وہ ساری مجھے بھا گئی ہے۔

بارہویں آواز : (نسوانی) ہلدی کی پڑیا کہاں ہے؟ پیسے جوڑو۔

(قہقہہ طویل ہو جاتا ہے۔ پھر یہ گونج پانی کی لہروں کے شور میں ڈوب جاتی ہے۔ چپو چلتے ہیں۔)

ایک آواز : ملّے، جال سمیٹ لے...... مچھلیاں مری ہوئی ہیں۔

دوسری آواز : ٹوکری بھر لی۔ اب کہتا ہے مچھلیاں مری ہوئی ہیں۔

پہلی آواز : اور کیا؟ دیکھتا نہیں؟ پانی پر تیل کی پرت۔

دوسری آواز : تیل کی پرت؟

پہلی آواز : ہاں! اور نہیں تو کیا؟ مگھا کہتا تھا کوئی پیپ (pipe) پھٹ گیا ہے۔

دوسری آواز : ہوں...... جبھی تو مچھلیوں کے ماس سے گندھ آتی تھی۔ مجھے تو کل اُلٹی ہو گئی۔

پہلی آواز : لیکن وہ شہر کے ہوٹل کا چھوکرا سب لے لے گا۔ ان میں کیسر ملا دیتے ہوں گے۔

دوسری آواز : ابے کیا بک رہا ہے۔ کیسر کے نام پر تو بھٹے کی داڑھی بکے ہے۔

پہلی آواز : ہوں...... اور اینٹ میں مرچ کا، چورا...... دھنیے میں لکڑی کا برادہ اور گھوڑے کی لید۔

پانچویں آواز : (دُور سے، کلاس روم میں) سر ولیم جونس، میکس ملر اور رائز ڈیوز نے مشرق کی روحانیت کے سرچشمے سے وہ پیاس بجھائی تھی جسے مغرب کے صنعتی اور میکانکی تمدن کی گرمی نے ہوا دی تھی۔ مغرب کا مادی کمال روحانی زوال کا حاصل تھا۔ مشرق، حق کا متلاشی، تہذیب ذات کا ترجمان اور باطن کی صفائی کی علامت تھا۔ روح دُنیاوی کثافتوں کی کھوٹ سے دُور۔

چھٹیں آواز : مشرق اور مغرب...... یہ لکیریں۔

ساتویں آواز : اب دو تہذیبوں کی بحث ختم ہو چکی میرے عزیز! سنو کہتا ہے۔

آٹھویں آواز : ہم سب کے سروں پر ایک آکاش، پیروں کے نیچے ایک ہی دھرتی ہے۔

نویں آواز : کنفیوشیس کا قول ہے......

دسویں آواز : کنفیوشیس کو تو کب کے دھکے مار کر......

گیارہویں آواز : امام شافعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں......

بارہویں آواز : سنت کبیر کہہ گئے ہیں......

(ملے جلے قدموں کی آواز قریب آتی ہوئی، دروازے پر دستک)

دوسری آواز : میں!

پہلی آواز : تم؟

دوسری آواز : ہاں!

پہلی آواز : اور کون ہے؟

دوسری آواز : یہ!

(دروازہ کھلتا ہے)

پہلی آواز : اوہ تم اور یہ ہو...... میں سمجھا تم اور وہ ہو۔

دوسری آواز : تم شاید کچھ لکھ رہے تھے۔

پہلی آواز : مقولے نقل کر رہا تھا۔

تیسری آواز : مقولے صرف نقل کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ایک کاغذ سے دُوسرے کاغذ پر سیاہی کا کفن...... اسی کفن میں پڑے پڑے سوکھ جاتے ہیں۔

[ہواؤں کا شور]

[فیڈ اِن]

راوی : سب پیاسے ہیں۔ سب پیاسے ہیں۔ دلوں کی پیاس کھوکھلے لفظوں سے کب بجھی ہے؟

(پس منظر سے ہوا کے شور کے ساتھ)

Water water every where
but not a drop to drink!

راوی : پانی، حد نظر تک پانی...... لیکن...... سنو لوگو! میں جو کہنا چاہتا ہوں اور تم جو سننا نہیں چاہتے، وہ سب حرف حرف، نقطہ نقطہ، ہواؤں کی پیشانی پر لکھا ہے۔ میں نے یہ تحریر اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور لفظوں کے ملبے سے آگہی کے موتی چنے ہیں اور میرا دل ان ہی لفظوں کے بوجھ سے نڈھال ہے اور آنکھ اسی تحریر کے منظر سے بے حال ہے۔ لوگو! سنو!

(قہقہہ)

راوی : وہ جب سفر پر نکلے تھے رات تھی۔ مگر آسمان پر ستارے تھے اور زمین کی گرد ان تک نہ پہنچی تھی۔ اس لیے وہ روشن بھی تھے۔ وہ ستارے انہوں نے نوچے اور اپنی پلکوں میں سجا لیے اور زرخیز زمینوں کی جستجو میں سروں کے بل تیزی

سے لڑھکتے گئے کہ ان کی زبانیں، نئے ذائقوں کی جویا تھیں...... اور اب، اب یہاں بھی رات ہے۔

ایک آواز : یہ رات نہیں، دِن ہے۔ دیکھو! لوگ جاگ رہے ہیں اور اسٹیشن پر کتنی بھیڑ ہے۔

راوی : اور وہ قافلے، راتوں کے اس سلسلے میں کھو گئے ہیں۔

آواز : (جھنجلا کر) تمہاری آنکھیں چمک سے خیرہ ہیں......اور تم! اسے رات کہتے ہو؟

راوی : اُنہیں تلاش ہے لوگو! اس رات کی حدوں کی، جن سے گزر کر یہ اپنے آپ تک پہنچیں گے۔

آواز : سب اپنے آپ سے بھاگ رہے ہیں۔ حشیش اور ای۔ ایس۔ ڈی اور معاشی ترقی...... کسی کو اپنی تلاش نہیں۔

(بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز۔ کتے بھونکتے ہیں)

الف : یہ کتا پاگل ہے۔

بے : یہ......؟ یہ زرد کتا؟

الف : ہاں۔

بے : تم بیکار ڈر رہے ہو۔ (یہ تو تمہاری پرچھائیں ہے)

جیم : رُک جاؤ...... رُک جاؤ...... آگے سمندر ہے۔ پانی گندا ہے اور مچھلیاں زہریلی۔

دال : (ہانپتے ہوئے) میری پیاس، سمندر کے پانی سے نہیں بجھے گی۔ اور میری بھوک، مچھلیوں سے نہ دُور ہوگی۔ آج سبت کا دن ہے...... میری اُلجھن کچھ اور ہے۔

جیم : کیا؟

(سانسوں کی آواز...... خاموشی)

جیم : میری طرف دیکھو...... تم مجھے نہیں پہچانتے۔

دال : خوب پہچانتا ہوں۔ (ڈوبی ہوئی آواز) لیکن مجھے جانے دو! جانے دو مجھے۔
جیم : کیوں؟
دال : مجھے اس زرد کتے سے ڈر لگتا ہے۔ اپنے آپ سے (بھاگتا ہے)
ہے : تم میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟
واؤ : تمہاری گفتگو غیبتوں کی غذا پر پلتی ہے اور میں اپنے آپ سے بھرا بیٹھا ہوں۔
ہے : تم مجھے اب تک نہ سمجھ سکے۔
واؤ : میں تمہیں خوب سمجھتا ہوں کہ تم میں کوئی پیچ نہیں...... اور مجھ میں اور تم میں بس ایک رشتہ ہے، نفرت کا۔ مجھے جانے دو!
(بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز)

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

(دروازے پر دستک...... دروازہ کھلتا ہے)

پہلی آواز : کیا کر رہے ہو؟
دوسری آواز : ایڈیٹوریل...... سنو۔ (پڑھتا ہے) ہم جو انفرادیت اور انفرادی آزادی پر اتنا زور دیتے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم سارے رشتے بھلا بیٹھے ہیں۔ ہم بات کرتے ہیں سماج میں انسان کی تنہائی اور بے بسی اور بے مہری کی اور ایسا لگتا ہے کہ ہم سب تنہائی کے احساس...... اور المیے کے شکار ہیں۔ لیکن ہم، اپنی ذاتی زندگیوں میں سماجی جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، سمجھوتے کرتے ہیں، سچ سے ڈرتے ہیں، ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالتے ہیں، رقابت کی آگ میں جلتے ہیں، ہم لفظوں کے اس کاروبار میں، کسی اخلاقیات کے پابند ہوتے، تو ہمارے لفظ بھی اتنے بے جان اور کھوکھلے نہیں ہوتے...... اور شاید

معنی سے ان کا رشتہ یوں نہ ٹوٹتا۔ ہم......

(ایک اچانک قہقہہ......اس کی گونج طویل ہوتی جاتی ہے)

ایک آواز : تم اس طرح سفیدی اور سیاہی کے خانے نہیں بنا سکتے۔ ہر عمل، گھناؤنا اور بدترین عمل بھی، انسانی عمل ہے۔ اس پر حیران کیوں ہوتے ہو؟ ہزاروں برس کی ہواؤں کے تھپیڑے کھا کر بھی تم ہوش میں نہیں آئے گدھے۔

دوسری آواز : والدین احمق ہیں۔ وہ سورج کے سامنے بند باندھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، دُنیا کبھی نہیں بدلے گی، کبھی نہیں، لیکن یہ تو بدل گئی۔

راوی : (بہت دُور سے) تو سنو لوگو! (وقفہ) نہیں اے لوگو! اب میں کچھ نہ کہوں گا کہ لفظوں پر اعتبار نہیں رہا......اور خاموشی......سنو! خاموشی کچھ کہتی ہے۔

(ہوا کا شور، پانی کی لہریں، پس منظر سے بھیانک موسیقی)

راوی : سب پیاسے ہیں......سب جھوٹے ہیں......سب کھوکھلے ہیں......لوگو! تمہارے سفر کی یہ کون سی منزل ہے جہاں آوازوں کی بھیڑ میں، تم فرد فرد، حلقہ حلقہ، قوم قوم، ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہو، اور پچھلی ساعتیں پتھر بن چکی ہیں، اور ہواؤں کے ماتھے پر، لہو کی لکیر ہے۔ اور پرانے دانشوروں کے قبیلے کی ایک بوڑھی روح نے مجھ سے کہا تھا۔ تکا تکا بوٹیوں کو جوڑ کر جسم نہیں بنائے جا سکتے۔ اسی لیے اے لوگو! اب نئے شہر بھی نہ بسیں گے اور پرانی بستیاں اس قافلے کی گردِ راہ میں کھو جائیں گی کیونکہ وہ جن سے نئے شہر آباد ہوتے، ربر کی دیواروں سے ٹکرا کر اپنی کھوئی ہوئی جنت کے دروازوں تک آ کر، واپس لوٹ جاتے ہیں اور سیال غلاظتوں کی مثال، گندی نالیوں میں بہہ جاتے ہیں۔

(ہواؤں کا شور......گھوڑوں کی ٹاپ......سواریوں کے گھونگھرو......موٹر کا ہارن......انجن کی سیٹی......مل کا بھونپو......سب ایک ساتھ گونجتے ہیں۔ گھڑی کی ٹک ٹک ٹک ٹک ٹک ٹک، چلتے ہوئے پیروں کی تھاپ پر)

راوی : لوگو! رُک جاؤ......رُک جاؤ......رُک جاؤ۔ (وقفہ)

ایک آواز : (پکارتے ہوئے) منے! او منے! یہ کیا انگڑ کھنگڑ تم نے پھیلا رکھا ہے؟ یہ سب اپنی باسکٹ میں سمیٹو۔ سارا فرش گندا ہو رہا ہے...... لے جاؤ اپنے کھلونے!

دوسری آواز : (ہانپتے ہوئے) پانی!

تیسری آواز : (جھنجلا کر) اونہہ! کیوں ہر وقت آنکھیں پھوڑتے رہتے ہو؟ کتاب بند کرو! اُٹھو! باہر نکلو۔ نہیں تو اندھے ہو جاؤ گے۔

(ہوا اور پانی کی لہروں کا شور......حزنیہ موسیقی)

[فیڈ آؤٹ]

○○

پانچویں سمت

پانچویں سمت

آوازیں :

(۱) راوی

(۲) سیّد صاحب	:	خاندان کے سربراہ
(۳) عالیہ	:	سیّد صاحب کی بیٹی، جوان، بیوہ
(۴) باجی بیگم	:	سیّد صاحب کی بیگم
(۵) سلطان	:	ایک قلندر
(۶) فرحت	:	عالیہ کا بھائی، کالج کا طالب علم
(۷) جمیلہ	:	عالیہ کی بیٹی، عمر لگ بھگ آٹھ برس
(۸) منجھو میاں	:	باجی بیگم کے بھائی، نکمے، چرب زبان

[فیڈ اِن]

(افتتاحی موسیقی)

[فیڈ آؤٹ]

(سناٹا)

راوی : (دُور سے آتی ہوئی گونجیلی آواز) اندھیرے میں ڈوبی ہوئی یہ پرانی حویلی...... نور منزل ہے۔ رات ہر شئے کو پُر اسرار بنا دیتی ہے۔ سو یہ حویلی بھی ایک پرانی پرچھائیں کی صورت کھڑی ہے۔ اس حویلی میں بیس کمرے ہیں۔ آج اس کے مکینوں کی تعداد کل پانچ ہے۔ حویلی کے چار طرف میدان پھیلے ہوئے ہیں۔ اب سے آگے ان میں امرود اور فالسے کے باغ ہوا کرتے تھے اور سامنے جہاں دن بھر گرد اُڑا کرتی ہے، اب سے آگے یہاں پھولوں کی کیاریاں تھیں اور ہرے مخملیں قطعے، باہری گیٹ پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ اس کتبے سے تم حویلی کی عمر کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ سنِ تعمیر ۱۸۹۸ء...... اس حساب سے یہ حویلی اسّی برس پرانی ہے۔ لیکن نہیں! ٹھہرو! میں سوچ کر بتاتا ہوں...... (گھڑی کی ٹک ٹک ٹک) یہ حویلی جس کھنڈر کی بنیادوں پر تعمیر ہوئی تھی اور اس کھنڈر سے پہلے بھی یہاں جو مکان بنے اور ڈھے گئے، اُن کے سارے سلسلے پر نظر ڈالو تو پتا چلے گا کہ چار سو برس پہلے جو گھر بسا تھا اُسی

کے مکینوں کا لہو اس حویلی کے مکینوں کے لہو میں شامل ہے...... گھر بنے اور اُجڑے اور ہوتے ہوتے لہو کی اس دھار کا قصہ نُور منزل تک جا پہنچا...... سیّد نُور اللہ فاطمی کہ اس حویلی کے پہلے مالک تھے، اب اپنے آبائی قبرستان میں اجداد کے بیچ محوخواب ہیں۔ الگ الگ زمانوں کی بساط پر ہنستے کھیلتے، جیتے جاگتے چہرے پھر ایک ہو گئے۔ موت دانہ دانہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوؤں کو چنتی ہے اور اپنی جھولی بھرتی جاتی ہے۔

[وقفہ...... ہوا کا پُر شور جھونکا۔ گرتے ہوئے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ]

راوی : سیّد نُور اللہ فاطمی کے بعد بھی اس حویلی کا شہر آباد رہا، اور آج بھی آباد ہے کہ ۱۸۹۸ء کے بعد سے، اب تک اس کا ڈھانچہ وہی کا وہی ہے۔ پہلے حویلی کے پندرہ کمروں میں لوگ رہتے تھے، پانچ مہمانوں کے لیے وقف تھے اور اکثر یہی دیکھا گیا کہ وہ پانچ کمرے بھی بھرے پڑے ہیں۔ دیوان خانہ، کتب خانہ، طعام خانہ ان بیس کمروں کے علاوہ تھا۔ اب پانچ کمرے آباد ہیں اور پندرہ خالی کہ برس ہا برس سے اس حویلی کے مکین اولاد کی کثرت سے گھبراتے ہیں۔ طرح طرح سے ان کی تعداد گھٹانے کے جتن کرتے ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ سب کی صحتیں بیماری آزاری کی مار سہنے کے لائق ہیں، نہیں تو یہ گنتی شاید اور کم ہو جاتی۔

[ہوا کا شور...... پتوں کی کھڑکھڑاہٹ]

راوی : خیر! کچھ بھیدوں کو بھید رہنے دو۔ ویسے بھی یہ کہانی بہت طولانی ہے۔ گئے دنوں کی بات چھوڑو اور اب کا احوال سنو! یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ آج اس کے مکینوں کی تعداد کل پانچ ہے۔ سیّد نصرت اللہ فاطمی جو اس کنبے کے سربراہ ہیں، ایک کمرے میں وہ رہتے ہیں۔ دوسرا کمرہ باجی بیگم کا ہے، سیّد نصرت اللہ فاطمی کی بیگم...... تیسرے کمرے پر عالیہ کا قبضہ ہے، سیّد صاحب اور باجی بیگم کی جوان بیٹی جو دو برس ہوئے بیوہ ہو گئی اور میکے والوں کی خواہش پر

سسرال سے واپس آ گئی...... یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس فیصلے میں عالیہ کے سسرال والوں کی مرضی بھی شامل رہی ہوگی...... چوتھا کمرہ فرحت کا ہے۔ عالیہ کا چھوٹا بھائی۔ کالج میں انجینئرنگ کا کورس پڑھتا ہے اور پانچویں کمرے کے مکین کا نام ہے جمیلہ...... آٹھ برس کی بچی، جو دن بھر اس کمرے میں رہتی ہے اور رات اپنی ماں کے بستر پر گزارتی ہے...... عالیہ نے اُسے اسکول بھی نہیں بھیجا۔ اس کا کمرہ پرانے کھلونوں، کہانی کی پرانی کتابوں، پرانی تصویروں سے بھرا ہے کہ نئی کتابیں اور نئے کھلونے اس حویلی میں خریدے نہیں جاتے۔

[پس منظر سے ہوا کا شور، دُور سناٹے میں ایک مجنونانہ قہقہے کی گونج۔]

[فیڈ اِن]

سیّد صاحب : (تھکے ہوئے لہجے میں اپنے آپ سے) اللہ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے!

(دُور قہقہے کی گونج...... بازگشت کے ساتھ)

سیّد صاحب : (دھیرے سے) وہ آرہا ہے، آرہا ہے...... اللہ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔ (اچانک گلا صاف کرتے ہوئے) عالیہ، عالیہ بیٹی!

[باورچی خانے میں برتنوں کی کھٹ پٹ]

عالیہ : (دُور سے) جی آئی...... آتی ہوں!

[آتی ہے]

سیّد صاحب : روٹی پک گئی بیٹی؟

عالیہ : (دھیرے سے) جی!

سیّد صاحب : وہ آرہا ہے...... اس کے لیے نکال دو۔

عالیہ : کون......؟ سلطان بابا؟

سیّد صاحب : ہاں۔

[قہقہے کی آواز قریب سے آتی ہوئی۔]

عالیہ : (منہ بنا کر) اُف میرے خدا! کیسی بھیانک آواز ہے۔

سیّد صاحب : کس کی آواز؟

عالیہ : سلطان بابا کی...... اور کون۔

سیّد صاحب : ایسا نہ کہو بیٹی! اللہ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔ اس کے حصے کا رزق الگ نکال رکھو۔

[عالیہ چلی جاتی ہے۔ باورچی خانے میں کھٹ پٹ۔]

باجی بیگم : (قریب آتے ہوئے) تمہارے ابا نے نماز پڑھ لی بیٹی؟

عالیہ : جی امی۔

باجی بیگم : اُن کا کھانا اُتار رہی ہو؟

عالیہ : نہیں۔

باجی بیگم : پھر یہ کٹورے میں کیا ہے؟

عالیہ : ابی نے کہا ہے سلطان بابا کا کھانا نکال رکھوں۔

باجی بیگم : (غصے میں جل کر) غضب ہے۔ ابھی گھر والوں کے حلق سے نوالہ نہیں اُترا اور انہیں سلطان بابا کی فکر پڑ گئی۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ موا پاگل ہے لیکن کھانے کا وقت دماغ سے لگا رہتا ہے۔ شام ہوئی اور آپہنچا۔ میں کہتی ہوں ایسی بھی کیا خیر خیرات! دُنیا جہان کے ثواب کمانے کی ایک اِن ہی کو فکر لگی ہے۔

عالیہ : کیا حرج ہے اگر ایک آدمی کا پیٹ اِس بہانے بھر جاتا ہے؟

باجی بیگم : ہاں ہاں! کیوں نہیں؟ آخر تم بھی تو رئیس زادی ہو نا!

[سیّد صاحب چھڑی ٹیکتے ہوئے قریب آتے ہیں۔]

سیّد صاحب : (حیرت سے) کیا بات ہے بیگم؟

باجی بیگم : وہ موا خبطی...... میں کہتی ہوں......

سیّد صاحب : (بھاری آواز میں) اللہ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے!

باجی بیگم : یہ ساری ذلت اپنے کرموں کا پھل ہے۔ غضب خدا کا۔ لوگ اب تک یہ سمجھتے ہیں کہ نُور منزل کے تہہ خانوں میں دفینے چھپے ہیں، لیکن...... لیکن اب یہاں رکھا کیا ہے۔ دو وقت کا رزق مشکل سے ملتا ہے۔ اس میں بھی حصے بٹانے والے موجود۔

سیّد صاحب : (دھیرے سے) خدا سے ڈرو بیگم، خدا سے ڈرو! سب اپنا رزق کھاتے ہیں۔ اس کے حکم کے بغیر......

باجی بیگم : (جھنجلا کر) میں موئی کیا ایسی کوڑھ مغز ہوں؟ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی۔ ٹھیک ہے، پاک پروردگار کا حکم سر آنکھوں پر! لیکن اللہ نے عقل بھی تو دی ہے۔ باپ دادا نے دونوں ہاتھوں سے لٹایا، ہمارے حصے میں کیا آیا؟ یہی ڈھنڈ ہار حویلی...... ہم تو اس لائق بھی نہیں رہ گئے کہ سال بہ سال اس کی دیواروں پر سفیدی ہی پھروا دیں۔

[پس منظر سے سلطان بابا کا قہقہہ]

سیّد صاحب : (خودکلامی کے انداز میں) آ گیا، وہ آ گیا! عالیہ!

عالیہ : جی ابی!

سیّد صاحب : اس کا رزق اسے دے دو۔

عالیہ : جی ابی!

سیّد صاحب : اسے عزت سے بٹھاؤ، پھر کھانا لے جانا۔

عالیہ : جی ابی!

باجی بیگم : (بہت غصے میں) جی ابی جی ابی کا وظیفے پڑھے جا رہی ہو! وہ کوئی

مہمان ہے؟ رئیس زادہ ہے؟

سیّد صاحب : ایسا نہ کہو بیگم! ایسا نہ کہو۔

[پس منظر سے سلطان بابا کی چھڑی کی کھٹ کھٹ]

سلطان بابا : (باہر سے) نصرت اللہ!

سیّد صاحب : بیٹی عالیہ! جاؤ، بٹھاؤ اُسے

[عالیہ باہر جاتی ہے۔ ہیجان خیز موسیقی کی ایک لہر جو دھیرے دھیرے معدوم ہو جاتی ہے۔]

[وقفہ]

[فیڈ اِن]

[دروازے پر دستک]

فرحت : (اندر سے) کون؟

عالیہ : یہ میں ہوں۔

فرحت : (دروازہ کھولتے ہوئے) اوہ! بجو! کیا بات ہے؟

عالیہ : میرا ایک کام کرو گے فرحت؟

فرحت : کہو۔

[سگریٹ سلگاتا ہے]

عالیہ : یہ تم پھر انجن کی طرح دھواں اُگلنے لگے۔ کتنی بار کہا یہ لعنت چھوڑ دو، کلیجہ جل جائے گا۔

فرحت : (ہنس کر) وہ تو کب کا جل چکا بجو! ہاں کہو، کیا کہہ رہی تھیں؟

عالیہ : پہلے یہ دھونکنی بند کرو۔ مجھے متلی ہوتی ہے اس کی بُو سے۔

فرحت : (ہنس کر) لو! [سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے سے مسل دیتا ہے]

اب کہو۔

عالیہ : سنا ہے شہر میں نمائش لگی ہے۔

فرحت : (کچھ سوچ کر) ہوں! پھر؟

عالیہ : پھر کیا؟ میں چاہتی تھی آج شام مجھے اور جمیلہ کو گھما دو۔ تم جانو، گھر میں دن رات پڑے پڑے طبیعت اُلجھنے لگتی ہے۔

فرحت : طبیعت کا کیا ہے...... وہ تو باہر بھی اُلجھ سکتی ہے۔

عالیہ : ہوگا! تم اس کی فکر چھوڑو۔ بتاؤ! چلو گے کہ نہیں۔

فرحت : چلوں گا۔ مگر ان دنوں میرا خزانہ بالکل خالی ہے۔

عالیہ : پیسے مجھ سے لے لینا۔

فرحت : پیسے؟ پیسے آئے کہاں سے؟

عالیہ : وہ بائیں باغ کی طرف والا پیڑ ہے نا شیشم کا، میں نے بیچ دیا۔ امی سے نہ بتانا۔

فرحت : اور اُنہیں خبر ہو گئی تو؟

عالیہ : اُنہیں کہاں سے خبر ہو جائے گی؟ گھر سے باہر کی دُنیا کا اُنہیں کچھ پتا نہیں۔ امی سے بھی نہ کہنا۔

فرحت : تو کیا پیڑ کٹ گیا؟

عالیہ : کل کٹ جائے گا۔ میں امی سے کہہ دوں گی کہ میں نے مفت دے دیا ہے کشور کو۔ کشور کا مکان بن رہا ہے نا۔ یہ امی جانتی ہیں۔

فرحت : (کچھ رُک کر) وہ تو ٹھیک ہے مگر تم جانو، امی کو مطمئن کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ گھر سر پر اُٹھا لیں گی۔ ہو سکتا ہے کشور ہی سے پوچھ بیٹھیں۔

عالیہ : تم تو مستقبل کے اندیشے سے ہی دُبلے ہونے لگے۔ وہ سڑک کے اُس پار بشیر فرنیچر والا رہتا ہے نا! میں نے اسی سے معاملہ طے کر لیا ہے۔ پیشگی دام لے لیے ہیں۔

فرحت : (کچھ سوچ کر) ٹھیک ہے۔ چلیں گے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہیں نمائش چلنے کی کیوں سوجھی؟

عالیہ : اب بحث مت کرو۔ بس یوں ہی دل چاہا۔

فرحت : (ایک لمحے کی خاموشی کے بعد) ویسے بجو! اتنے پرانے پیڑ کا کٹنا اچھا نہیں ہے۔

[عالیہ ایک طویل قہقہہ لگاتی ہے۔]

عالیہ : (ہنسی روکتے ہوئے) تم بھی آخر کو وہی نکلے۔ ہمارے کس کام کا تھا وہ پیڑ؟

فرحت : اونہہ ہوگا! خیر چلیں گے جمیلہ کو بھی لے چلیں گے۔

[دروازے کے باہر قریب آتے ہوئے پیروں کی چاپ]

فرحت : شاید ابی آرہے ہیں۔

عالیہ : (ہونٹ پر اُنگلی رکھ کر) شش! اُن کے سامنے ذکر نہ کرنا۔

سیّد صاحب : (باہر سے) فرحت!

فرحت : (اُٹھتے ہوئے) جی ابی، آیئے۔

سیّد صاحب : (اندر آکر) مجھے ایک بات کہنی تھی تم سے۔

فرحت : جی۔

سیّد صاحب : وہ جو پچھواڑے شیشم کا پیڑ ہے نا......؟

عالیہ : (ہڑبڑا کر) ج ج جی! جی ہاں! ہے تو۔

سیّد صاحب : کیا رائے ہے تمہاری اگر اسے کٹوا دیا جائے؟

عالیہ : (حیرت سے) کٹوا دیا جائے؟ مگر کیوں؟

سیّد صاحب : اس کے تنے میں گھن لگ رہا ہے۔ ایک جھکڑ کا وار بھی نہ سہہ سکے گا۔ دادا جان مرحوم نے لگوایا تھا۔ شیشم کی لکڑی کا فرنیچر اُنہیں بہت پسند تھا۔ کئی پیڑ تھے۔ ایک ایک کر کے سب کٹتے گئے۔ اب وہی ایک بچ رہا

ہے۔ اور اس کا بھی کیا ٹھکانہ۔

عالیہ : لیکن اسے کٹوا کر ہم کریں گے کیا؟

سیّد صاحب : کسی کو دے دیں گے۔

عالیہ : (خوش ہو کر) اوہ ہاں ہاں! کشور بھی مجھ سے مانگ رہی تھی۔

سیّد صاحب : کشور؟ کشور کون؟ وہ تمہاری سہیلی؟

عالیہ : جی ہاں ابی، وہی۔

سیّد صاحب : اُسے کیوں چاہیے؟

عالیہ : اُسے کچھ چوکھٹیں بنوانی تھیں۔ ایک روز میں ان کے گھر گئی تھی۔ وہیں بات چلی۔ میں نے کہہ دیا کہ پیڑ کٹوا لیں۔ ان بیچاروں کی کچھ سہولت ہو جائے گی۔

سیّد صاحب : اچھا کیا تم نے، بہت اچھا کیا۔

عالیہ : تو میں کہلوا دوں کشور کو کہ کل کٹوا لیں پیڑ!

سیّد صاحب : بیٹی، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم خود اس کے پٹرے بنوا کر بھیج دیتے۔

عالیہ : (بن کر) اونہہ! اب یہ جھنجٹ کون پالے۔ بشیر فرنیچر والا جو ہے نا۔

سیّد صاحب : ہاں ہاں۔

عالیہ : اُسی سے دروازے چوکھٹیں بنوا رہے ہیں وہ لوگ۔ میں کہلا دوں گی کہ بشیر کو بھیج دیں۔

سیّد صاحب : ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ (اُٹھ جاتے ہیں۔)

[چھڑی ٹیکتے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں۔]

[فیڈ اِن]

[پیڑ کاٹا جا رہا ہے۔ کلہاڑیوں اور ریتی کے چلنے کی آوازیں۔ پس منظر سے

باجی بیگم کی آواز اُبھرتی ہے اور رفتہ رفتہ اس شور پر غالب آجاتی ہے۔]

باجی بیگم : غضب خدا کا۔ اچھا بھلا پیڑیوں شہید کر دیا گیا۔ میں کہتی ہوں مجھ سے بھی ایک دفعہ جھوٹوں ذکر کر دیتے۔ پھر میں دیکھتی۔ اچھی من مانی ہے۔ صاحبزادے ہیں کہ ان کا دماغ ہر وقت آسمان پر رہتا ہے۔ اب اور تو اور صاحبزادی کو بھی وہی نشہ چڑھ گیا۔ اچھی بھلی بزرگوں کی نشانی، ایک آن میں فنا کر دی۔

عالیہ : (قریب آتے ہوئے) امی آپ تو بلاوجہ بات کا بتنگڑ بنا رہی ہیں۔

باجی بیگم : ہائے ہائے، میں بات کا بتنگڑ بنا رہی ہوں۔ زبان تو دیکھو۔ میں نہ ہوئی نوکر لونڈیوں سے بھی گئی گزری ہوگئی۔ میں بات کا بتنگڑ بنا رہی ہوں۔

عالیہ : (جھنجلا کر) اور نہیں تو کیا؟ اب جانے بھی دیجیے۔

باجی بیگم : جانے کیوں دوں! کون سی تمہارے میاں کی کمائی ہے۔

عالیہ : (روہانسی ہوکر) تو کیا اس گھر میں میرا کچھ نہیں ہے؟ میں غیر ٹھہری؟

باجی بیگم : لڑکی ایک بار گھر چھوڑ دے تو غیر ہی ہو جاتی ہے۔

عالیہ : (روکر) تو میں غیر ہوں!

باجی بیگم : میں کہتی ہوں بلا مجھ سے پوچھے تم نے کشور کو زبان کیوں دی؟ اور اُسے بھی شرم نہیں آتی! مفت خور! ایسا ہی گھر بنوانے کا شوق تھا تو بازار سے خرید لیتے! پھر کون سا خزانہ بھرا ہوا ہے؟ اپنی چیز تھی، اپنے کام آتی تو بات بھی تھی...... تم کون ہوتی ہو اس طرح لٹانے والی؟

عالیہ : میں کوئی بھی نہیں؟ کوئی نہیں؟

باجی بیگم : ہاں ہاں، کوئی نہیں!

عالیہ : (ہسٹریائی انداز میں) امی!

[سیّد صاحب گھبرائے ہوئے آتے ہیں]

سیّد صاحب : کیا بات ہے بیگم؟ کیا ہوا؟ عالیہ بیٹی کیا بات ہے؟

عالیہ : (روتے ہوئے) امی سے پوچھئے...... [وہاں سے چلی جاتی ہے]

سیّد صاحب : عالیہ...... عالیہ!

باجی بیگم : ان ہی نخروں نے تو اور اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔

سیّد صاحب : (دھیمے لہجے میں) یہ تو کہو کہ ہوا کیا؟

باجی بیگم : ہوا کیا؟ اب مجھ سے پوچھتے ہو۔ تمہیں کچھ پتا نہیں؟ گھر کی اینٹ سے اینٹ بج جائے اور تمہیں خبر نہ ہو۔

سیّد صاحب : (رحم طلب انداز میں) بیگم!

باجی بیگم : میں کہتی ہوں یہ پیڑ کٹوایا کیوں گیا؟

سیّد صاحب : جسے اس کی ضرورت تھی، اس کے کام آجائے تو کیا بُرا ہے؟

باجی بیگم : لیکن عالیہ کو کیا حق تھا؟ اس نے تم سے اجازت لی تھی؟ مجھ سے پوچھا تھا؟

سیّد صاحب : ہاں، مجھ سے ذکر کیا تھا اس نے، پھر مان لو کہ اسی نے اپنی مرضی سے دے دیا تو کیا بُرائی کی؟

باجی بیگم : کیا بُرائی کی؟ تو تمہارے خیال میں اس نے بڑی نیکی کا کام کیا ہے؟ شاباشی دی جائے اُسے؟ اُسے اس طرح من مانی کرنے کا کیا حق ہے؟

سیّد صاحب : ایسا نہ کہو بیگم، یہ نہ کہو۔ اس کا دل پہلے ہی بہت دُکھا ہوا ہے۔ جوان بیٹی اور بیوگی کے غم سے دوچار! ہمیں اس کا دل رکھنا چاہیے۔

باجی بیگم : تو دل رکھنے کا یہ مطلب کہاں سے نکلتا ہے کہ وہ اس طرح کی من مانی کرنے لگے۔ کل کلاں کو ساری حویلی ہی کسی کو بخش دے۔ آخر کو رئیس زادی ہے۔

سیّد صاحب : شکر کرو اپنے حال پر اور غم نہ کرو ان نعمتوں سے محرومی کا جن کے بغیر بھی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔

باجی بیگم : بس ان ہی باتوں نے تو اس گھر کا ستیاناس کر دیا۔ کیا نہیں تھا اب سے آگے! نوکر چاکر، لونڈی خدمت گار، روپیہ پیسہ، مال دولت...... اللہ

نے کیا کیا نہ دیا تھا۔ لیکن دیکھتے دیکھتے کنگال ہو گئے۔ زمینداری اوروں کی بھی ختم ہوئی مگر کوئی اس حال کو نہ پہنچا۔

سیّد صاحب : (گویا اپنے آپ سے) اللہ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔

باجی بیگم : ٹھیک ہے۔ مرضیِ مولا میں چارا نہیں۔ مگر اپنی عقل بھی تو کوئی چیز ہے۔ عالیہ میری دُشمن تو نہیں۔ اپنے ہی بدن کا حصہ ہے۔ موئی قسمت کی ماری...... جوان جہاں لڑکی کا گھر اُجڑ گیا۔ پھر اب اس کی اکیلی جان تو نہیں۔ آخر کو جمیلہ بھی اُس کے ساتھ ہے۔ میں کہتی ہوں کہ اگر یہی چلن رہا تو ان کی زندگی کیسے گزرے گی؟

سیّد صاحب : جیسے سب کی گزر جاتی ہے۔

باجی بیگم : تو کیا سب کی زندگی ہماری ہی جیسی گزر رہی ہے؟ موئے رذیل کما کما کر عزت والے ہو گئے۔ غفورا کی پانچ پشتیں اسی ڈیوڑھی کی خدمت میں گزر گئیں۔ آج وہ سیٹھ عبدالغفور بنا بیٹھا ہے۔ خراد کی مشین کیا لگائی کہ گھر اشرفیوں سے بھر گیا۔ اب پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔

سیّد صاحب : حسد نہ کرو بیگم۔ یہ وہ آگ ہے جو تمام نیکیوں کو جلا دیتی ہے۔

باجی بیگم : مجھے اس وعظ پند کی ضرورت نہیں۔ میں نے بھی دو حرف پڑھے ہیں۔ جانتی ہوں نیکی کیا ہے! اس کا انجام کیا ہے! اسی کے ہاتھوں تو تم بھی اس گت کو پہنچے ہو۔

سیّد صاحب : میں اپنے حال سے باخبر ہوں اور خوش ہوں اس بات پر کہ دُنیا سے بے خبری کو میں نے شعار کیا۔ تم دُنیا کو جتنا جانو گی اتنے صدمے اُٹھاؤ گی۔

باجی بیگم : (جھنجلا کر) تو بند کر لوں اپنی آنکھیں، کانوں میں روئی ٹھونس لوں؟ سوچنا بند کر دوں؟ اسی بے حسی نے تو یہ دِن دِکھائے۔

[پس منظر سے سلطان بابا کا ایک قہقہہ]

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

(دُور سے آتی ہوئی گونجیلی آواز جو رفتہ رفتہ روشن ہوتی جاتی ہے۔)

راوی : اے لوگو! حیران نہ ہو کہ یہ تماشہ ختم ہونے کا نہیں۔ بلندی اور پستی، کمال اور زوال...... ان میں اب کوئی بھید باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اس حویلی کے پانچ کمرے جنہیں پانچ جانوں نے آباد کر رکھا ہے، اس حویلی کی بربادی کے جیتے جاگتے نشان ہیں۔ اور وہ پندرہ کمرے جہاں اب کوئی نہیں رہتا اور جو آج ڈھنڈار پڑے ہیں، اب بھی عہدِ رفتہ کی عظمتوں کے تصوّر سے آباد ہیں۔ کبھی بستیاں ویران دِکھائی دیتی ہیں اور خراب آباد۔ یہ سارا تماشہ بس سوچ کی شعبدہ بازی کا ہے۔ سیّد نوُراللہ فاطمی نے جس برس یہ حویلی آباد کی، اُس کے گوشے گوشے میں روشنی کے ذخیرے تھے۔ رات اور دن کے فاصلے مٹ گئے تھے۔ جھاڑ، فانوس، قمقمے، رت جگے، رقص و سرود کی محفلیں اور شادیانے اندھیروں کا مذاق اُڑاتے تھے۔ لیکن اندھیرا کہ ایک موج تہہ نشیں کی صورت اندر ہی اندر پھیلتا جاتا تھا۔ بالآخر اس حویلی کے چپے چپے پر، اس کی حکومت قائم ہوگئی۔ وہ آبادیاں جن کے دم سے اس حویلی کی رونق تھی، بربادیوں کا پیش خیمہ بن گئیں۔ اس کے مکینوں نے بھی سوچنا چھوڑ دیا تھا۔

[وقفہ...... ہوا کا پُرشور جھونکا، گرتے ہوئے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ]

راوی : وہ سوچنے سے ڈرتے تھے اور سو طرح کے جتن کرتے تھے کہ سوچنے کی اذیت سے دُور رہیں۔ سیّد نوُراللہ فاطمی کے بیٹوں نے عیش کے راستوں میں اپنی جوانیاں لٹا دیں اور وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے۔ ان کے بڑے بیٹے سیّد حبیب اللہ نے پتنگ بازی میں بڑا نام کمایا اور ایک روز خود بھی کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح بے سہارا، موت کے دھندلکوں میں گم

ہو گئے۔ ان سے چھوٹے سیّد مجیب اللہ تھے، اللہ والے! اپنے آپ سے بھی بے پروا! گھر جائیداد کے قضیوں سے بے نیاز اپنے اوراد و وظائف میں ڈوبے رہے اور جب یہ دیکھا کہ اب دیکھنے کو اور کچھ نہیں رہ گیا تو آنکھیں بند کرلیں۔ سیّد نصرت اللہ فاطمی اُن ہی کی اولاد میں سے ہیں۔ سیّد مجیب اللہ اُن کے دادا تھے۔ انہوں نے دادا ہی کے ہاتھوں پرورش پائی کہ ان کے والد ان کے پیدا ہوتے ہی چل بسے تھے۔ عمر ایسی زیادہ نہ تھی لیکن مرے تو پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ ایک ایک کرکے سب زمانے کی گرد بنتے گئے اور اب اکیلے سیّد نصرت اللہ فاطمی بچ رہے ہیں کہ اُن ہی کے دم سے حویلی کی ڈیوڑھی پر چراغ جلتا ہے۔

[وقفہ............ ہوا کا پُرشور جھونکا]

راوی : نہیں! میں نے غلط کہا! یہ حویلی تو اکثر اندھیرے میں ڈوبی ہی دِکھائی دیتی ہے۔ وہ پانچ کمرے جن میں دھیمی دھیمی روشنیاں جھلملاتی ہیں، اُن سے آگے، اُن کے باہر چارسو تاریکی ہی تاریکی ہے۔ اس وقت رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ دو کمروں کے سوا ساری حویلی پر اندھیرے کا تسلط ہے۔ ایک کمرہ فرحت کا ہے جسے رات دیر تک جاگنے کی عادت ہے۔ دوسرا کمرہ سیّد نصرت اللہ فاطمی کا ہے۔ رات گئے دیر تک مصلّے پر بیٹھے وظیفے پڑھتے رہتے ہیں۔ باجی بیگم اور عالیہ کے کمروں میں عام طور پر جلدی ہی اندھیرا پھیل جاتا ہے کہ اُنہیں جلدی سو جانے کی عادت ہے۔ سیّد صاحب وظیفے سے فارغ ہوئے۔ مصلے سے کھجور کی گٹھلیوں کے دانے والی تسبیح اُٹھائی اور سجدہ گاہ کے ساتھ طاقچے پر رکھ دی۔ اب وہ روشنی گل کرنے کے لیے بڑھ رہے ہیں۔ لو! اندھیرا۔ اب وہ سو جائیں گے...... یا سونے کی کوشش کریں گے۔ ہر رات یہ گھڑی

اُن کے لیے بہت کٹھن ہوتی ہے کہ اس وقت یادیں اُنہیں اکیلا اور تنہا پا کر یلغار کر دیتی ہیں۔ حافظے کی بساط میدانِ عمل بن جاتی ہے۔ ان سے لڑتے لڑتے جب وہ بے حال ہو جاتے ہیں تو سو جاتے ہیں۔ (سرگوشی کے انداز میں) سو گئے، سو گئے۔ سب سو گئے۔ بس ایک کھڑکی ابھی کھلی ہوئی ہے...... (موسیقی کی ایک حزینہ لہر)

[وقفہ......... فرحت سگریٹ سلگانے کے لیے ماچس کی تیلی بار بار ڈبیا پر رگڑتا ہے۔ آخر کو تیلی جل جاتی ہے۔]

عالیہ : سیل گئی ہے ڈبیا!

فرحت : (بے خیالی میں) ہوں!

عالیہ : لاؤ، اسے چولہے پر رکھ دوں، ٹھیک ہو جائے گی۔

فرحت : ہوں۔

عالیہ : نمائش اچھی تھی۔

فرحت : ہوں!

عالیہ : جمیلہ بہت خوش ہوئی۔

فرحت : (اُسی انداز میں) ہوں!

عالیہ : (جھنجلا کر) یہ کیا ہوں ہوں لگا رکھی ہے؟

فرحت : (سوالیہ انداز میں) ہوں......؟

عالیہ : میں تم سے بات کر رہی تھی نا فرحت!

فرحت : (جمائی لے کر) او بجو! دھیان کتاب پر تھا۔ ہاں، کیا پوچھ رہی تھیں؟

عالیہ : اب پھر سے دہراؤں؟ میں کہہ رہی تھی جمیلہ بہت خوش ہوئی۔

[جمیلہ بھاگتی ہوئی کمرے میں آتی ہے۔]

جمیلہ : (خوشی سے تقریباً چلاّتے ہوئے) ماموں میاں، ماموں میاں!

فرحت : کیا ہے بٹو؟

جمیلہ : دیکھو میرے نئے کھلونے۔

فرحت : دیکھے ہیں...... رات ہی تو دیکھے ہیں۔

جمیلہ : اونہہ...... رات میں دیکھے، اب دن میں بھی دیکھو۔

فرحت : (پُر خیال انداز میں) ہوں!

عالیہ : (جھنجلا کر) یہ تم کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو آخر۔ کتنا خوش ہو رہی تھی نئے کھلونے پا کر...... تمہیں دِکھانے لائی ہے اور تم ہو کہ جانے کس خیال میں گم ہو۔

فرحت : میں سوچ رہا تھا بجو کہ پُرانی چیزیں کھوئے بغیر نئی چیزیں ہاتھ نہیں آتیں۔ پیڑ کٹ گیا نا؟

عالیہ : ہاں!

فرحت : امی کو زیادہ ناگواری تو نہیں ہوئی؟

عالیہ : ہوئی تو...... مگر ابی کی خاموشی نے آئی بلا ٹال دی۔

جمیلہ : (بیچ میں) دیکھو...... دیکھو ریل گاڑی...... کیسا چلتی ہے۔ اس پر بیٹھو گے ماموں میاں؟

فرحت : (ہنس کر) ہاں۔

جمیلہ : کہاں جانا ہے تمہیں؟

فرحت : سفر پر۔

جمیلہ : سفر پر تو سبھی جاتے ہیں۔ یہ بتاؤ ٹکٹ کہاں کا لیا ہے؟

فرحت : ٹکٹ! ٹکٹ کی کیا ضرورت ہے؟

جمیلہ : واہ...... بلا ٹکٹ بیٹھو گے ریل پر؟

فرحت : مجھے کچھ پتہ ہی نہیں کہاں جانا ہے۔ اچھا کہیں کا بھی ٹکٹ دے دو۔

[وقفہ......... جمیلہ ایک کاغذ پھاڑتی ہے۔]

جمیلہ : (ہنس کر) یہ لو۔

فرحت : یہ کیا ہے بٹو!

جمیلہ : ٹکٹ۔

فرحت : کہاں کا ٹکٹ؟

جمیلہ : پریوں کے دیش کا...... چلو! بیٹھ جاؤ! ابھی ہم لوگ سونے کے محل میں پہنچ جائیں گے۔

[عالیہ قہقہہ لگا کر ہنستی ہے]

فرحت : واہ پگلی...... پریوں کے دیش میں بھی کہیں ریل گاڑی چلتی ہے؟

جمیلہ : (حیرانی سے) پھر کیا سواری چلتی ہے ماموں میاں!

فرحت : اُڑن کھٹولہ...... بیٹھ جاؤ اور ایک آن میں جہاں چاہو، جا پہنچو۔ راستے میں سمندر بھی پڑتے ہیں، پہاڑ بھی، ہرے بھرے میدان بھی اور اگر جادوگروں کی فوج راستے میں روکے تو اپنے اُڑن کھٹولے پر بیٹھے بیٹھے پتھر لڑھکا دو۔ سب کچل جائیں گے۔

جمیلہ : (حیرت سے) تو پھر پتھر لے آؤں ماموں میاں؟

فرحت : پتھر کہاں ہیں؟

جمیلہ : واہ......! اتنا بھی نہیں جانتے؟ اِتنے تو پتھر ہیں یہاں۔ وہ جو دیوار گری تھی...... ہے نا!

فرحت : (ہنس کر) بیوقوف! وہ پتھر نہیں، مٹی کے ڈھیلے ہیں۔ جبھی تو دیوار گر گئی۔

جمیلہ : تو کیا پتھر کی دیوار نہیں ٹوٹتی؟

فرحت : نہیں!

جمیلہ : پتھر کی دیوار ویسی ہی ہوتی ہے جیسی ہمایوں کے مقبرے کی ہے۔

فرحت : ہاں!

جمیلہ : (ہنس کر بے وقوف بنانے کے انداز میں) واہ واہ! وہ تو ٹوٹی ہوئی

ہے۔ٹوٹی ہوئی ہے نا امی۔

عالیہ : افوہ! کتنی کج بحثی کرتی ہو جمیلہ تم۔

جمیلہ : یہ کج بحثی کیا ہوتی ہے؟

عالیہ : یہی بک بک...... جو تم کر رہی ہو۔

جمیلہ : (بسورتی ہوئی) ماموں میاں! تو میں بک بک کر رہی ہوں؟

فرحت : (سنجیدگی سے) نہیں بٹو! تم ہم سب سے زیادہ سمجھ دار ہو۔

جمیلہ : (خوش ہو کر) نانا ابا سے بھی زیادہ۔

فرحت : ہاں۔

جمیلہ : اور نانی امی سے بھی زیادہ؟

فرحت : ہاں ہاں!

جمیلہ : اور امی سے بھی زیادہ؟

فرحت : ہاں ہاں ہاں!

جمیلہ : اور تم سے بھی زیادہ؟

فرحت : ہاں بابا ہاں۔

[عالیہ اور فرحت ایک ساتھ ہنسنے لگتے ہیں۔ پس منظر سے طربیہ موسیقی]

[فیڈ آوٹ]

[فیڈ اِن]

[شام کا تاثر۔ آبادی کا شور دھیرے دھیرے کم ہوتا جاتا ہے۔ دُور پس منظر سے سلطان بابا کے قہقہے کی ایک لہر۔ پھر رفتہ رفتہ اُس کی لاٹھی کی مسلسل ٹھک ٹھک قریب آتی ہوئی۔]

سلطان بابا : (دُور سے) مولا بھیج!

سیّد صاحب : (کپکپاتی ہوئی آواز) آرہا ہے، وہ آرہا ہے۔ اللہ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔

[وقفہ...... سلطان بابا کی لاٹھی کی ٹھک ٹھک قریب آجاتی ہے۔ پھر رُک جاتی ہے۔]

سلطان بابا : (باہر سے) باجی بیگم!

باجی بیگم : (بڑبڑاتے ہوئے) آگیا کم بخت! ہانڈی چولہے سے اُتری نہیں اور آپہنچا۔

سیّد صاحب : (باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے) ایسا نہ کہو بیگم۔ اس کا رزق اس کے حوالے کر دو۔

باجی بیگم : ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ آخر کو اللہ نے اِس کی ذمہ داری ایک ہمی پر تو ڈالی ہے۔

سیّد صاحب : یہ تو خوش بختی کی بات ہے بیگم...... تم کھانا نکالو! میں دے آتا ہوں۔

[بیگم منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی کھانا نکالتی ہیں۔]

باجی بیگم : (روکھائی سے) یہ لو۔

[سیّد صاحب کھانا لے کر دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔]

[وقفہ]

سیّد صاحب : آگئے سلطان بابا!

سلطان بابا : (گونجیلی آواز میں) ہاں...... لاؤ۔

سیّد صاحب : ہاتھ تو دھولو، وہ لوٹے میں پانی رکھا ہے۔

سلطان بابا : نصرت اللہ ایک بات پوچھوں؟

سیّد صاحب : کیا بات ہے بابا...... کہو۔

سلطان بابا : تمہیں یاد ہے......؟ لیکن تمہیں کیا یاد ہوگا؟

سیّد صاحب : کیا؟

سلطان بابا : (خوابناک لہجے میں) ایک رات اس حویلی پر ایسی بھی آئی تھی جب......!

[رُک جاتا ہے۔]

سیّد صاحب : (کپکپاتی ہوئی آواز میں) کیا! آخر کیا ہوا تھا؟

[پس منظر سے بادلوں کی گرج]

سلطان بابا : جب اس کے سارے مکین جاگتے رہے؟

سیّد صاحب : جاگتے رہے؟ جاگتے رہے؟ کیا کبھی اس گھر کے لوگ جاگے بھی تھے؟

سلطان بابا : ہاں! وہ رات تباہی کی آخری دستک تھی!

[پس منظر سے ہوا کا شور]

اس رات تمہارے والد کا انتقال ہوا تھا۔ یاد ہے تمہیں؟

سیّد صاحب : (ہکلا کر) نن نہیں! نہیں!!

سلطان بابا : ایک وہی تو جاگنے والے تھے اس حویلی کے مکینوں میں۔ ان کی شب بیداریاں تمہارے حصے میں آئی ہیں نصرت اللہ! ان کی موت کے بعد پھر سب سو گئے اور اب تک سو رہے ہیں۔

سیّد صاحب : (کپکپاتی ہوئی آواز میں) کھانا کھاؤ سلطان بابا! کھانا کھاؤ اور مجھے نماز کے لیے جانے دو۔

سلطان بابا : جاؤ......مگر جانے سے پہلے مجھے ایک بات بتاؤ۔

[وقفہ]

سلطان بابا : باجی بیگم کو ناگواری تو نہیں ہوتی؟

سیّد صاحب : کس بات پر؟

سلطان بابا : میرے آنے پر؟

سیّد صاحب : ناگواری! ناگواری کیوں ہونے لگی۔

سلطان بابا : ان سے کہہ دو نصرت اللہ کہ ہم بھی نہ رہے تو اس چوکھٹ پر کون آئے گا اور ہم نہ آئیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ساٹھ برس کا ریاض ہے۔

سیّد صاحب : (پُرخیال انداز میں) ساٹھ برس؟

سلطان بابا : ہاں! ساٹھ برس...... تمہاری عمر ابھی اتنی تو نہ ہوگی۔

سیّد صاحب : نہیں۔

سلطان بابا : اس بستی کے اور مکین بھی ہیں جہاں مجھے روٹی مل سکتی ہے۔ لیکن میں نے، زمانہ بدل گیا، اپنی وضع نہ بدلی۔ اور لوگ (ہنس کر) مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔

سیّد صاحب : (کپکپاتی ہوئی آواز میں) ہم تو نہیں سمجھتے بابا۔

سلطان بابا : ہر شام میرا یہاں آنا بستی کے مکینوں کو یاد دلاتا ہے کہ اس چوکھٹ سے ایک فقیر کا رزق بندھا ہوا ہے۔ مجھے پتہ ہے...... تم پر بار ہوتا ہوگا۔

سیّد صاحب : (ہانپتے ہوئے) نہیں...... نہیں! ایسا نہ کہو۔

سلطان بابا : یہ تو وقت کا تماشہ ہے نصرت اللہ! دُنیا کو دیکھتے جاؤ اور اپنی حیرانی سے دامن چھڑاؤ۔ جب سب کچھ سمجھ لوگے تو حیرانی اپنے آپ دُور ہو جائے گی۔

سیّد صاحب : مجھے کوئی شکایت نہیں اپنے اللہ سے۔ (ٹھنڈا سانس بھر کر) اللہ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔

[دفعتہً سلطان بابا کا ایک قہقہہ بلند ہوتا ہے۔ پس منظر سے ہیجان خیز موسیقی۔]

سیّد صاحب : (کانپتے ہوئے) سلطان بابا...... سلطان بابا!!

[سلطان بابا کا قہقہہ بلند ہوتا ہے...... موسیقی]

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

عالیہ : (پُکارتے ہوئے) جمیلہ...... او جمیلہ!

[بھاگتی ہوئی آتی ہے۔]

جمیلہ : جی امی!

عالیہ : یہ چہرہ کیسا لال ہو رہا ہے؟ باہر دھوپ میں ماری ماری پھر رہی تھی؟

جمیلہ : تو کیا کروں امی؟ آپ نے پیڑ کیوں کٹوا دیا؟

عالیہ : پیڑ...... مجھے پیڑ سے کیا لینا۔

جمیلہ : میں اس کے نیچے کھیلتی تھی ......اور امی!

عالیہ : (ایک پل کی خاموشی کے بعد) کیا ہے؟

جمیلہ : ایک بات سنو۔

عالیہ : کیا؟

جمیلہ : اس پیڑ پر جو چڑیاں بیٹھتی تھیں، اب کہاں رہتی ہوں گی؟

عالیہ : (سسکی لے کر) جمیلہ!

جمیلہ : جی امی!

عالیہ : ایسی باتیں نہیں سوچتے بٹو۔

جمیلہ : کیوں؟ اچھا میں نانا ابا سے یا ماموں میاں سے پوچھوں گی۔

عالیہ : نہیں! اُن سے نہ پوچھنا۔ سنا۔

جمیلہ : کیوں؟

عالیہ : بس یوں ہی...... کہہ جو دیا۔

[فرحت کے پیروں کی چاپ]

فرحت : کیا کہہ دیا بجو!

عالیہ : کچھ نہیں! کچھ بھی نہیں۔

جمیلہ : میں بتاؤں ماموں میاں؟

فرحت : ہاں ہاں۔

عالیہ : (تنبیہ کے انداز میں) جمیلہ!

جمیلہ : (منہ بناتے ہوئے) خود تو بتاتی نہیں ہو اور پوچھنے بھی نہیں دیتیں۔

عالیہ : بک بک مت کرو۔

فرحت : (حیرت سے) کیا بات ہے بجو؟

عالیہ : کچھ نہیں! کچھ بھی نہیں!!

فرحت : (وقفہ) اچھا، مجھے جمیلہ سے پوچھنے دو۔ کیا بات ہے جمیلہ!

جمیلہ : میں یہ پوچھ رہی تھی...... پیڑ کٹ جانے کے بعد وہ چڑیاں کہاں گئیں بیچاری؟

فرحت : (حیرت سے، ذرا اونچی آواز میں) تم اس سوال سے پریشان تھیں بجو؟ [خاموشی]

فرحت : (جذباتی لہجے میں) جن چڑیوں کے رہنے کا ٹھکانہ نہیں ہوتا وہ اُڑ جاتی ہیں، کسی اور ٹھکانے کی تلاش میں...... سمجھیں جمیلہ!

عالیہ : (سسکی لے کر) فرحت!

فرحت : سوال چاہے جیسے بھی ہوں، ٹالنے سے فائدہ؟ بتاؤ بجو اسے! ابھی سے بتا دو۔ ایسا نہ ہو کہ جب اسے اس سوال کا جواب ملے تو وہ اسے سہنے کی تاب نہ لا سکے۔

جمیلہ : (بسورتے ہوئے) آپ تو لڑنے لگے ماموں میاں!

فرحت : نہیں بٹو! (رُک کر) میں تو تمہاری بات کا جواب سوچ رہا تھا۔

جمیلہ : تو بتاؤ۔

فرحت : ایک پیڑ کٹ جانے سے چڑیاں بے گھر تھوڑی ہی ہو جاتی ہیں۔ کوئی اور پیڑ ڈھونڈ لیتی ہیں۔ چڑیاں ہماری طرح بے وقوف نہیں ہوتیں بٹو، کہ پیڑ چاہے کٹ جائے، جڑ سے اُکھڑ جائے، کہیں اور جانے کی ہمت نہیں کرتے۔

جمیلہ : تو ہم بے وقوف ہیں۔

فرحت : ہاں...... ہم سب بے وقوف ہیں۔

جمیلہ : نانا ابا بھی؟

عالیہ : (چیخ کر) جمیلہ...... بدتمیز، نالائق، یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے؟

[جمیلہ سہم کر رونے لگتی ہے۔ عالیہ بھی رونے لگتی ہے۔]

فرحت : (گھبرا کر) بجو! مجھے معاف کر دو بجو۔ (جذباتی لہجے میں) مجھ سے بھول ہوئی۔

عالیہ : (رُک رُک کر، روتے ہوئے) میں نہیں چاہتی کہ جمیلہ پر ابھی سے اس دَرد کا سایہ پڑنے لگے۔ میں تو اپنے آپ کو بھی بھولنے کے جتن کرتی ہوں کہ وہ سب کچھ بھول جاؤں جس کے حوالے سے اپنا خیال آجاتا ہے۔ سب کچھ بھول جاؤں۔

[عالیہ پھر سسکیاں لینے لگتی ہے............ پس منظر سے حزنیہ موسیقی]

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

باجی بیگم : (دیگچی میں کفگیر چلاتی جاتی ہیں) اب کیا بتاؤں! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سب اپنے حال میں مگن ہیں۔ (بڑبڑا کر) اونہہ! دیکھو...... آنکھوں میں مرچیں لگنے لگیں۔ موئی لکڑیاں ایسی گیلی ہیں۔ خدا کی پناہ...... اچھا بھلا پیڑ تھا۔ دوسروں کے ہتھے چڑھ گیا۔ ہوگا، مجھے کیا۔ جو بھی ہے، جھیل لوں گی۔ مگر تم کسی وقت ذرا فرحت کو تو سمجھاؤ! منجھو میاں، ذرا سوچو تو۔

منجھو میاں : میں کیا سمجھاؤں باجی بیگم۔

باجی بیگم : یہی کہ ایسی بے نیازی بھی کیا۔ لگتا ہے کسی سے کوئی مطلب ہی نہیں۔ اپنی کتابیں، اپنا کمرہ...... باقی سب جائیں جہنم میں۔ فرحت کے ابا کا

حال تم جانتے ہی ہو۔ فقیری کا لبادہ اوڑھ کر سمجھتے ہیں دُنیا کے آزار سے بچ گئے۔ ہوگا۔ پھر عالیہ کا حال دیکھو! کتنا کہا بی بی پرائیویٹ ادیب کامل کا امتحان پاس کر لے۔ کہیں نوکری سے لگ جائے گی۔ آخر کو جمیلہ کا بوجھ بھی سہارنا ہے۔ مگر لگتا ہے اس لڑکی نے کل کے بارے میں سوچنا ہی بند کر دیا ہے۔

منجھو میاں : فرحت کا کون سا سال ہے انجینئری کا؟

باجی بیگم : آخری...... دو مہینے کی بات اور ہے۔ ابھی سے نوکری کے لیے ہاتھ پیر مارے تو شاید کچھ ہو جائے............

[بیرونی دروازے پر دستک]

باجی بیگم : (چونک کر) ارے منجھو میاں! ذرا دیکھو تو۔ کون موا ناوقت ٹپک پڑا ہے۔

[دستک جاری ہے۔ منجھو میاں جاتے ہیں، چند لمحوں بعد واپس آتے ہیں۔]

منجھو میاں : یہ لفافہ آیا ہے۔ ڈاکیہ دے گیا۔

باجی بیگم : دیکھو تو کس کا ہے...... چھمن باجی کا تو نہیں۔ انہیں میں نے کوئی ہفتہ دس دن پہلے ایک خط ڈالا تھا۔ اتنی جلدی جواب آ گیا۔

منجھو میاں : یہ تو انگریزی میں ہے۔

باجی بیگم : انگریزی میں...... انہیں کون سی انگریزی آتی ہے۔ ہو نہ ہو فرحت کا ہوگا۔ ہاں۔ فرحت ہی کا ہوگا۔

منجھو میاں : (اٹک اٹک کر) ایف۔ اے۔ آر۔ فر۔ ایچ۔ اے۔ ٹی۔ ہاں، فرحت ہی کا ہے۔

باجی بیگم : تم تو انگریزی پڑھ لیتے ہو، ذرا دیکھو تو۔

منجھو میاں : اب اتنی انگریزی کہاں آتی ہے باجی بیگم...... نام پتا پڑھ لینا اور بات ہے۔

باجی بیگم : خیر...... چھوڑو...... لاؤ رکھ دوں...... فرحت آئے تو دے دوں گی۔ لیکن تم ذرا اس سے کہو تو۔

منجھو میاں : کیا؟

باجی بیگم : (جھنجلا کر) دُنیا کو تم عقل سکھانے کا دعویٰ کرتے ہو اور بچہ بن کر مجھ سے پوچھتے ہو کیا؟ کیا؟ ارے تم خود نہیں دیکھتے، کیا حال ہے گھر کا؟

منجھو میاں : (سنجیدگی سے) آنے دیجیے، بات کروں گا۔

باجی بیگم : ہاں بھیا! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ لوگ اب تک اس فریب میں ہیں کہ نوُر منزل میں خزانے گڑے ہیں۔

منجھو میاں : (اُچک کر) اے تو کیوں نہ سمجھیں؟ کیا نہیں تھا اس سرکار میں۔ عزت، دولت، ہاتھی مرے پر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔

باجی بیگم : (حیرت سے) ایں؟

منجھو میاں : (اُسی ترنگ میں) خدا بخشے میں نے اس خاندان کے ان بزرگوں کی آنکھیں بھی دیکھی ہیں جن کی ہیبت سے زمین کانپتی تھی۔ اب تک بستی میں ان کی کہانیاں گشت کرتی ہیں۔ کہتے ہیں پتنگوں میں سونے کے چھلے باندھ کر بازیاں بدی جاتی تھیں۔ مرغوں کو ہیرے جواہرات کا کشتہ کھلایا جاتا تھا۔ جبھی تو ان کی بانگ پر شیروں کے دل بھی دہل جاتے تھے۔

باجی بیگم : (حیرت سے) منجھو میاں؟

منجھو میاں : (اُسی رو میں) کتنوں کا رزق بندھا ہوا تھا اس در سے! ساری بستی جانتی ہے کہ نوُر منزل میں کھانا دیگچیوں میں نہیں پکتا تھا۔ دیگیں اُترتی تھیں، اور کوئی درجن بھر باورچی اس سرکار سے وابستہ تھے۔

باجی بیگم : (کپکپاتی ہوئی آواز میں) منجھو میاں!!

منجھو میاں : میں کہوں گا فرحت سے...... اسے بتاؤں گا سب کچھ! اُسے یاد دلاؤں گا کہ وہ کس خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ ریاست رہے نہ رہے، رئیسی

کی خوُبوُ تھوڑی جاتی ہے...... لیکن یہ آج کل کے لونڈوں کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔ نہ رئیسوں کے شوق نہ وہ حوصلے...... میں کہتا ہوں......

باجی بیگم : (چیخ کر) منجھو میاں............

[پس منظر سے ہوا کا شور اور دُور سے آتی ہوئی سلطان بابا کے قہقہے کی ایک گونج۔ چند لمحوں تک اسی قہقہے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔]

[فیڈ آ آوٹ]

[فیڈ اِن]

[باجی بیگم کی سسکیاں............ بیچ بیچ میں ہوا کا شور اور گرتے ہوئے پتوں کی آوازیں]

باجی بیگم : اللہ...... کوئی نہیں سمجھتا۔ کوئی نہیں سمجھتا۔ کس سے کہوں؟ کس کو سمجھاؤں؟ کون ہے جو اِن گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دے گا؟

سیّد صاحب : (ٹھہری ہوئی آواز میں) بیگم!

باجی بیگم : (بھرائی ہوئی آواز میں) یہ ساری تباہی تمہاری لائی ہوئی ہے۔ تم نے سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیا اور خود غافل ہو گئے۔ تم نے ایک پل کے لیے بھی نہ سوچا کہ زندگی کی گاڑی اس طرح نہیں چلتی۔

سیّد صاحب : (سانس بھر کر) اللہ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔

باجی بیگم : آج یہ ساری ذلت اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ اپنی ہی کرنی کا پھل ہے۔

منجھو میاں : خدا نہ کرے باجی! کیسی باتیں کرتی ہو۔ دولہا بھائی! اس گھرانے کی عظمت کے قصے ابھی یاد ہیں لوگوں کو۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا جب اس چوکھٹ پر ملازموں کی فوج............

باجی بیگم : (چیخ کر) منجھو میاں...... بند کرو یہ بکواس۔

منجھو میاں : (حیرت سے) جی...... م م میں کہتا ہوں......

باجی بیگم : چپ ہو جاؤ منجھو میاں! چپ ہو جاؤ۔ اب اور سننے کی تاب نہیں ہے۔

[عالیہ کا قہقہہ]

سیّد صاحب : عالیہ!

عالیہ : (ہنستے ہوئے) جی ابی! (پھر مسلسل ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔)

سیّد صاحب : عالیہ بیٹی! تم ہنس رہی ہو؟ ہنس رہی ہو؟ یہ نہ بھولو کہ ہنسی انسان کے باطن کو میلا کر دیتی ہے بیٹی۔

[عالیہ پھر دیوانہ وار ہنسنے لگتی ہے]

باجی بیگم : (بھرائی ہوئی آواز میں) اللہ...... میں پاگل ہو جاؤں گی۔

عالیہ : (ہنسی روکتے ہوئے) زیادہ سوچنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے امی۔ مجھے دیکھیے...... میں......

باجی بیگم : (تقریباً چیخ کر) عالیہ............

[اچانک فرحت کمرے میں داخل ہوتا ہے]

منجھو میاں : فرحت میاں!

فرحت : (طنز سے) جی!

[چند لمحوں تک سناٹے کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ پھر اچانک عالیہ پر ہنسی کا دورہ پڑتا ہے۔]

باجی بیگم : (جذباتی لہجے میں) عالیہ...... عالیہ!!

سیّد صاحب : (بڑبڑاتے ہوئے) یہ سب کیا ہے؟ تم ہنستی ہو بیٹی تو مجھے ڈر لگتا ہے۔

عالیہ : (اچانک سنجیدگی سے) آپ میری ہنسی سے ڈرتے ہیں ابی! میں آپ کی خاموشی اور ضبط سے۔ (پھر ہنسنے لگتی ہے)

منجھو میاں : تم اتنے خاموش کیوں ہو فرحت؟

فرحت : میں اس لیے چپ ہوں کہ مجھے ہنسنا نہیں آتا۔

سیّد صاحب : فرحت؟

فرحت : جی ابی! آپ میری فکر نہ کریں...... یوں بھی زندگی اگر تقدیر کے حوالے کر دی جائے تو آدمی فکروں سے بچ جاتا ہے......اب یہی دیکھئے۔ امی اتنا زیادہ سوچتی رہتی ہیں اور پریشان رہتی ہیں۔ آپ تمام فکروں سے بے نیاز ہیں۔ امی طرح طرح کے وسوسوں میں مقید۔ بجو کو ہنسنا آتا ہے اس لیے وہ بھی آپ کی طرح محفوظ ہیں...... کیوں بجو!

عالیہ : میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کون سی بات ہے جس کی فکر کی جائے۔

منجھو میاں : ہاں، اور کیا۔ خدا کا دیا سب کچھ......

باجی بیگم : منجھو میاں! تم چپ رہو۔

فرحت : امی! (طنز سے) آپ ماموں میاں کو بار بار روک دیتی ہیں۔ آخر کیوں؟ انہوں نے زندہ رہنے کا ایک بہانہ ڈھونڈ لیا ہے...... ماضی...... یادیں۔ عیش و فراغت کی جھوٹی سچی کہانیاں جن کا شور حواس پر چھایا رہتا ہے اور انہیں ان تمام اُلجھنوں سے بچاتا ہے جن کی ڈور میں امی نے خود کو لپیٹ رکھا ہے۔ امی...... آپ...... بجو...... ماموں میاں...... یہ سب اس ڈرامے کے الگ الگ کردار نہیں بلکہ زندگی کرنے کے الگ الگ ڈھنگ ہیں...... الگ الگ رویے۔

سیّد صاحب : (کپکپاتی آواز میں) فرحت بیٹے!

فرحت : (اُسی رو میں) ابی آپ کا رویہ سیدھا سادا ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہوا وہ ہونا تھا اور جو کچھ بھی ہونا ہے، ہو کر رہے گا۔

سیّد صاحب : اللہ جسے چاہے عزت دے......

[عالیہ پھر ہنس رہی ہے]

فرحت : اور بجو تم! ہنستی رہو۔ یوں ہی ہنستی رہو۔ ابی تمہاری ہنسی سے ڈرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ بھی زندگی کا ایک طور ہے۔ وہ ڈرتے ہیں تو اس بات سے کہ ہنسی کبھی کبھی آنسوؤں کا نقاب بھی ہوتی ہے۔ کہیں یہ نقاب اُلٹ گئی تو...... تو کیا ہوگا؟ آپ کو یہی ڈرستاتا ہے نا ابی! لیکن گھبرائیے مت۔ آنسوؤں کا سیلاب ایسا ہی تند و تیز ہوتا تو یہ دیوارِ قہقہہ کب کی ٹوٹ چکی ہوتی۔

سیّد صاحب : (کپکپاتی ہوئی آواز میں) فرحت!

فرحت : بجو کی ہمت کی داد دیجیے ابی۔ انہوں نے تو اس دیوار میں اس وقت بھی رخنے نہیں پڑنے دیے جب خاندانی شرافت کے نام پر ایک فاقہ کش رئیس زادے کو ان کی قسمت کی باگ ڈور تھما دی گئی...... امی کی تسکین کے لیے یہ کافی تھا کہ ایک رئیس ابن رئیس کو انہوں نے اپنی غلامی میں لے لیا ہے۔

باجی بیگم : (روکر) فرحت! اتنے ظالم نہ بنو بیٹے! (رونے لگتی ہیں)

فرحت : (جذباتی لہجے میں) بہت دیر سے یہ بات سوچی آپ نے امی۔ آخر وہی ہوا نا جو میں کہتا تھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ افسانوں کے طلسم سے نکلیے...... آخر کیا بُرائی تھی سہیل میں...... یہی نا کہ اس کے خاندان کے گرد دولت و فراغت کی جھوٹی کہانیوں کا جال نہیں بچھا تھا۔ لیکن آپ نے کبھی باجی سے پوچھا...... (سختی سے) بتائیے...... آپ نے ایک لمحے کے لیے بھی کبھی یہ سوچا تھا کہ آپ کسی بے زبان مخلوق کا سودا نہیں کر رہی ہیں بلکہ اپنی بیٹی کے لیے بَر ڈھونڈ رہی ہیں۔

[عالیہ کی مجنونانہ ہنسی]

فرحت : ہنستی رہو بجو! اسی طرح ہنستی رہو۔ یہ لوگ تمہاری ہنسی سے ڈرتے ہیں۔ میں اس لمحے سے جب یہ ڈھال تم اپنے ہاتھوں سے گرا دو گی اور

نہتی ہو جاؤ گی...... کہنے دوامی کو اور اسی طرح ہنستی رہو۔

[باجی بیگم کی سسکیاں...... بیچ بیچ میں عالیہ کی ہنسی۔ پس منظر سے ہوا کا پُرشور جھونکا جو رفتہ رفتہ سارے ماحول پر چھا جاتا ہے۔]

راوی : (دُور سے آتی ہوئی گونجیلی آواز) آنسوؤں اور قہقہوں میں گندھی ہوئی یہ کہانی۔ اس کے ایک سرے پر ازل ہے، دُوسرے پر ابد...... یہ کہانی یوں ہی چلتی رہے گی...... کہ یہ کہانی جن کرداروں کی ہے وہ سب کے سب نکمتے ہیں...... اُنہیں اِس کی فکر نہیں کہ سمتوں کی بھول بھلیّاں میں کوئی ایسا راستہ ڈھونڈ نکالیں، جن پر سب ایک ساتھ چل سکتے ہوں...... باجی بیگم...... سید نصرت اللہ فاطمی...... منجھو میاں...... عالیہ...... چار سمتیں ہیں اور جس دائرے سے یہ تمام سمتیں نکلتی ہیں، ان پر صرف ایک پرچھائیں دِکھائی دیتی ہے۔

[ہیجان خیز موسیقی کی ایک لہر]

راوی : یہ پرچھائیں فرحت کی ہے...... اور اب یہ پرچھائیں نُور منزل کی دیواروں سے پرے کسی اور سمت کی تلاش میں بھٹک رہی ہے۔ دیکھو، آج حویلی کا وہ کمرہ بھی تاریک ہے جہاں رات گئے تک کھڑکی کے شیشوں سے دھیمی دھیمی روشنی چھنتی نظر آتی تھی۔ اس حویلی کے مکینوں میں ایک اور کمی...... اب صرف چار کمرے آباد ہیں...... سید نصرت اللہ فاطمی...... جو ابھی ابھی تہجد سے فارغ ہوئے ہیں اور سونے کے جتن کر رہے ہیں...... باجی بیگم، جو دن بھر کی مصروفیوں سے نڈھال، سو چکی ہیں...... عالیہ جس نے راتوں سے زبردستی اپنی نیند کا خراج وصول کیا ہے اور خوابوں کی قید سے آزاد ہے، اس لیے آرام سے نیند کی پہلی ہی دستک پر خود کو اس کے حوالے کر دیتی ہے...... اور جمیلہ...... جس کا کمرہ

پرانے کھلونوں، پرانی تصویروں، پرانی کتابوں سے بھرا رہتا تھا، اب خوش ہے کہ اس نے ساری پرانی چیزیں ایک ایک کر کے پھینک دی ہیں اور اپنے نئے کھلونوں میں مگن ہے۔

[پس منظر سے طربیہ موسیقی کی ایک لہر]

راوی : فرحت میاں...... کو نوکری مل گئی...... نُور منزل سے دُور، بہت دُور، اب ایک نیا مہمان خانہ اُن سے آباد ہے...... وہ دائرہ ٹوٹ چکا، شاید ٹوٹ چکا جس سے چار الگ الگ سمتوں کی شاخیں نکلتی تھیں۔

(پس منظر سے سلطان بابا کا طویل قہقہہ، بازگشت کے ساتھ)

[وقفہ]

سیّد صاحب : (بڑبڑاتے ہوئے) وہ آرہا ہے، آرہا ہے۔ (زور سے) عالیہ! عالیہ بیٹی!!

[سلطان بابا کی لاٹھی کے زمین سے ٹکرانے کی آواز قریب آتی جاتی ہے۔]

عالیہ : جی ابی...... (بھاگتی ہوئی آتی ہے)

سیّد صاحب : اس کا رزق اسے دے دو۔

باجی بیگم : (دُور سے) عالیہ بیٹی! (باورچی خانے کی کھٹ پٹ)

عالیہ : جی امی! (جاتی ہے)

باجی بیگم : یہ لو...... سلطان بابا کا کھانا...... اور جمیلہ سے کہو پانی کا لوٹا باہر پہنچا دے۔ اور ہاں بیٹی، کم ہو تو اور لے جانا۔ کہنا اچھی طرح پیٹ بھر کے کھائے۔

[عالیہ سینی میں کھانا سجا کر باہر لے جاتی ہے۔]

[وقفہ]

عالیہ : لو بابا۔

سلطان بابا : (گونجیلی آواز میں) کون...... عالیہ؟

عالیہ : جی۔

سلطان بابا : میرا رزق لائی ہو؟

عالیہ : جی۔

سلطان بابا : (کچھ سوچتے ہوئے) ہوں...... اور باجی بیگم ٹھیک ہیں؟ آج اُن کی بک بک نہیں سنائی دی۔

عالیہ : (حیرت سے) جی؟

سلطان بابا : لگتا ہے وہ آگ اب بجھنے والی ہے...... اور آگ کہاں ہے؟ کچھ چنگاریاں ہیں راکھ میں دبی ہوئی۔ فرحت کے پسینے کی چھینٹوں سے بجھ جائے گی۔

عالیہ : (حیرت سے) جی؟

سلطان بابا : تم کچھ نہیں جانتیں بیٹی، یا سب سے زیادہ جانتی ہو۔ آگہی حد سے سوا ہو جائے تو اس میں اور بے خبری میں کوئی بھید نہیں رہ جاتا۔ پھر سکھ اور دکھ ایک ہو جاتے ہیں۔ جمیلہ کہاں ہے؟

عالیہ : (دھیرے سے) یہیں کہیں ہوگی۔ کھیل رہی ہوگی۔

[اچانک کچھ دُور سے جمیلہ کی خوشی سے بھری چیخ سنائی دیتی ہے۔]

جمیلہ : (تالیاں بجاتے ہوئے) ماموں میاں آگئے...... آگئے۔

فرحت : (دَوڑ کر اُسے گود میں بیٹھاتے ہوئے) بٹو۔

سلطان بابا : کون؟ فرحت...... آگئے!

[فرحت کے قدموں کی چاپ]

فرحت : سلطان بابا!

جمیلہ : (گانے کے انداز میں) ماموں میاں آگئے، ماموں میاں آگئے،

ماموں میاں آ گئے۔

سلطان بابا : (گونجیلی آواز میں) تم آ گئے فرحت!

باجی بیگم : (دُور سے) کون......فرحت...... بیٹے تم آ گئے؟

جمیلہ : (ہنستے ہوئے) میرے لیے کیا لائے......کیا لائے ماموں میاں؟

سیّد صاحب : (باہر نکلتے ہوئے) فرحت۔

فرحت : آداب ابّی...... آداب امّی! بجو! تم ٹھیک ہو......ایں؟ تم ہنس نہیں رہی ہو۔

(عالیہ کی افسردہ ہنسی)

فرحت : (حیرت سے) بجو......کیا بات ہے؟ ایں!

باجی بیگم : (خوشی سے) ارے اندر تو آنے دو اُسے! سفر سے چلا آ رہا ہے اور باہر ہی اٹک گیا۔ عالی بیٹی!

سلطان بابا : جاؤ فرحت......اندر جاؤ...... باجی بیگم تمہیں بلاتی ہیں۔

جمیلہ : (مچل کر) نہیں! ماموں میاں میرے ساتھ کھیلیں گے ابھی...... ماموں میاں اِدھر آؤ۔

فرحت : (بھاری آواز میں) ہاں، ہم اپنی بٹو کے ساتھ جاتے ہیں۔ تم آگے آگے چلو، کدھر چلیں؟

جمیلہ : اُدھر میدان میں۔

فرحت : میدان میں؟

جمیلہ : ہاں، اور نہیں تو کیا...... گھر میں اندھیرا ہوگا۔

فرحت : اندھیرا......؟

جمیلہ : ہاں، دیکھ لو! صرف نانا ابا کے کمرے میں چراغ جل رہا ہے۔

سلطان بابا : (ڈرامائی لہجے میں) اور وہ روشنی بھی بہت مدھم ہے۔ بہت کمزور...... لے جاؤ جمیلہ بیٹی......فرحت کو لے جاؤ......اپنے ساتھ لے جاؤ۔

(جمیلہ ہنستی ہے)

جمیلہ : اِدھر آؤ ماموں میاں! ادھر!

فرحت : (ہنستے ہوئے) لو بھئی آ گئے۔ جدھر کہو اُدھر چلیں...... چلو۔

[دونوں آگے پیچھے بھاگتے ہیں۔ سلطان بابا کا ایک طویل قہقہہ]

سلطان بابا : جمیلہ بیٹی...... عالیہ کو بھی لے جاؤ...... باجی بیگم کو بھی لے جاؤ...... اور سیّد نصرت اللہ تم بھی جاؤ! جاؤ...... جاؤ...... جمیلہ کے ساتھ جاؤ۔

[پس منظر سے موسیقی کی ایک طویل لہر۔]

[فیڈ آؤٹ]

○○

اپنی اپنی زنجیر

اپنی اپنی زنجیر

آوازیں :

(۱) چودھری صاحب	:	بوڑھے، کرخت آواز، عالیہ اور سعدیہ کے ماموں
(۲) عالیہ	:	جوان العمر، جذباتی لہجہ۔
(۳) مکرم میاں	:	چودھری صاحب کے مصاحب
(۴) محمد طفیل	:	چودھری صاحب کے مصاحب
(۵) رمضانی	:	ملازم
(۶) عیدو	:	ملازم
(۷) علی	:	عالیہ کا بڑا بھائی
(۸) شبراتی	:	ملازم
(۹) اماں بی	:	عالیہ، علی، سعدیہ کی ماں
(۱۰) ممانی جان	:	چودھری صاحب کی بیگم
(۱۱) سعدیہ	:	عالیہ کی چھوٹی بہن

فیڈ اِن :

[ابتدائی موسیقی، طربناک اور دبنگ...... سرخوشی کے ساتھ ساتھ سخت کوشی کا تاثر]

[فیڈ آؤٹ کے ساتھ ہی چودھری انوار الحق حقے کے لگاتار کش لگاتے ہیں، پھر کھانسنے لگتے ہیں۔]

چودھری صاحب : (پکارتے ہوئے) ارے بھئی کوئی ہے؟ رمضانی! عیدو! شبراتی! افوہ...... یہ سب کے سب کہاں ہیں؟

[بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ، قریب آتی ہوئی]

عالیہ : جی ماموں جان!

چودھری صاحب : اوہ...... یہ تم ہو۔ ادھر مت آنا۔ مکرم میاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں کہتا ہوں، یہ رمضانی، عیدو، شبراتی کہاں ہیں؟ کب سے گلا خشک ہو رہا ہے۔

عالیہ : شربت بھجواؤں؟

چودھری صاحب : شربت! نہیں! اچھا ٹھیک ہے۔ مکرم میاں کے لیے شربت بھیج دو۔ میرے لیے سادہ پانی۔ گلا خشک ہو رہا ہے۔

[وقفہ]

عالیہ : یہ پانی لے لیجیے ماموں جان...... اور مکرم میاں کے لیے شربت!

[چودھری صاحب اُٹھ کر دروازے تک جاتے ہیں۔ پانی اور شربت کے گلاس لے کر آتے ہیں۔]

چودھری صاحب : یہ لو مکرم میاں...... شربت پیو۔

مکرم میاں : آپ نے ناحق بٹیا کو زحمت دی۔ مگر یہ شربت! اس کا رنگ؟

چودھری صاحب : رنگ ہی نہیں...... ذرا ذائقہ بھی دیکھو۔ بڑا پُرانا نسخہ ہے۔ ابا جان مرحوم کا ایجاد کیا ہوا۔ میں تو بس یہی شربت پسند کرتا ہوں۔ پیتا ہوں تو ابا جان یاد آجاتے ہیں۔ قسم قسم کی چیزیں اس میں ملائی جاتی ہیں۔ جبھی تو اس کا رنگ......

مکرم میاں : ہاں، عجیب رنگ ہے۔ کچھ زرد زرد، کچھ سبز سبز، کچھ سرخ سرخ۔

چودھری صاحب : (خوش ہو کر) اور مزہ؟

مکرم میاں : مزہ؟ سبحان اللہ، کچھ تُرش تُرش، کچھ میٹھا میٹھا، کچھ پھیکا پھیکا۔

چودھری صاحب : ارے میاں کھٹا میٹھا کیوں نہیں کہتے؟ یہی تو خوبی ہے اس میں۔ ہے نا لاجواب؟

مکرم میاں : بے شک۔

[پاس آتے ہوئے قدموں کی آواز۔]

چودھری صاحب : کون؟

رمضانی : میں ہوں سرکار...... رمضانی۔

چودھری صاحب : (غصے میں) کہاں مر گئے تھے؟

رمضانی : نماز کے لیے گیا تھا۔

چودھری صاحب : نماز کے لیے گئے تھے؟ (نرمی سے) اچھا جاؤ! اندر جاؤ۔

[رمضانی جاتا ہے............ پاس آتے ہوئے قدموں کی آواز۔]

چودھری صاحب : کون؟

عیدو : یہ میں ہوں سرکار...... عیدو۔
چودھری صاحب : تم کہاں مر گئے تھے؟
عیدو : (نرمی سے) نماز کے لیے گیا تھا۔
چودھری صاحب : (نرمی سے) نماز کے لیے، اچھا...... اندر جاؤ......

[عیدو اندر جاتا ہے ...... وقفہ...... چودھری صاحب حقے کا ایک طویل کش لیتے ہیں۔]

مکرم میاں : آپ کچھ سوچنے لگے چودھری صاحب۔
چودھری صاحب : مکرم میاں! آفتاب سر پر کب کا آیا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی۔ خیر، ابھی ظہر کا وقت ختم نہیں ہوا۔

[حقے کا کش لیتے ہیں۔]

مکرم میاں : آپ اچانک کسی سوچ میں گم ہو گئے۔
چودھری صاحب : سوچ...... نہیں تو! ہاں، کل رات ایک عجیب خواب دیکھا۔
مکرم میاں : خواب؟
چودھری صاحب : ہاں خواب، وہ بھی ٹھیک فجر کے وقت۔
مکرم میاں : بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ اس گھڑی جو خواب دیکھا جائے، سچ نکلتا ہے۔ بھلا کیا دیکھا آپ نے، کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو تو میں بھی سنوں۔
چودھری صاحب : (سنجیدگی سے) نہیں، ایسی ویسی تو کوئی بات نہیں۔
مکرم میاں : پھر؟
چودھری صاحب : میاں...... کیا دیکھتا ہوں کہ ایک لق و دق میدان ہے۔ آدم نہ آدم زاد۔ اتنے میں مشرق سے ایک سوار نمودار ہوتا ہے، چتکبرے گھوڑے پر شان سے بیٹھا ہوا...... اس کے پیچھے ایک جلوس۔
مکرم میاں : سبحان اللہ...... سبحان اللہ!!

چودھری صاحب: میں غور سے سوار کو دیکھتا ہوں۔ وہ بھی غور سے میری طرف دیکھتا ہے۔

مکرم میاں : سبحان اللہ...... سبحان اللہ!!

چودھری صاحب: آخر کو اُسے پہچان جاتا ہوں۔

مکرم میاں : سبحان اللہ!

چودھری صاحب: (جھنجلا کر) ارے میاں! یہ تو پوچھو کہ کون تھا؟

مکرم میاں : وہ کون تھا؟

چودھری صاحب: وہ کوئی اور نہیں...... میں تھا۔ [حقے کے تابڑ توڑ کئی کش]

مکرم میاں : سبحان اللہ! سبحان اللہ! سبحان اللہ!! کیا سعادت ہے؟ کیا نصیب ہے؟

[چودھری صاحب حقے کے کش پر کش لیے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ تیز رفتار موسیقی کی ایک لہر۔]

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

[دروازے پر دستک]

علی : (اندر سے) کون؟

عالیہ : یہ میں ہوں بھائی جان۔

علی : (دروازہ کھولتے ہوئے) اوہ! عالیہ! آؤ آؤ۔

[وقفہ]

علی : تم اتنی چپ چپ سی کیوں ہو؟

عالیہ : تم بھی تو چپ چپ سے ہو بھائی جان۔

علی : مم...... میں...... نن...... نہیں تو! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ رات نیند ذرا

دیر سے آئی۔ (جمائی لیتا ہے۔)

عالیہ : نیند دیر سے آئی؟ تو کیا سونے سے پہلے تم جاگ رہے تھے؟

علی : عجیب سوال ہے!

عالیہ : عجیب سوال ہے؟

علی : (دھیرے سے) ہاں! عجیب سوال ہے!

عالیہ : تو کیا سونے کے لیے ضروری ہے کہ آنکھیں بند بھی ہوں۔

علی : میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں بٹو۔ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

عالیہ : (طنزاً) وہی جو تم جانتے ہو، لیکن انجان بنے ہوئے ہو۔

علی : افتخار کہاں ہے؟ صبح سویرے گھر سے نکلا تھا۔ اب تک واپس نہیں آیا۔

عالیہ : افتخار بھائی تو روز ہی ایسا کرتے ہیں۔

علی : کک...... کیوں؟

عالیہ : اُنہیں نیند بھی نہیں آتی اور وہ جاگتے بھی رہتے ہیں۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میں پہیلیاں نہیں بجھا رہی ہوں۔ افتخار بھائی ہر روز صبح سویرے گھر سے نکل جاتے ہیں۔ شام ڈھلے واپس آتے ہیں۔ رات بھر گھر میں بھی جاگتے رہتے ہیں۔

علی : کیوں؟

عالیہ : کیونکہ سوچتے رہتے ہیں۔

علی : بیمار پڑ جائے گا۔ تم دیکھتی نہیں ہو، اُس کی صحت گرتی جا رہی ہے۔

عالیہ : ہاں! میں دیکھتی ہوں اور خوب سمجھتی ہوں۔ اماں بی بھی سمجھتی ہیں۔ جبھی تو ہر نماز کے بعد دیر دیر تک دُعائیں مانگتی رہتی ہیں۔ کیا تم سچ مچ نہیں سمجھتے؟ یا سمجھ کر بھی نہیں سمجھنا چاہتے۔

[دُور کسی پرندے کی چیخ............شام کے پانچ بجتے ہیں]

علی : (سگریٹ سلگانے کے لیے ماچس جلاتا ہے۔) یہ زوال کا وقت ہے۔

ہو۔ دل کو دُکھانے والی باتیں نہ کرو۔

عالیہ : چپ رہنے سے دُکھ دُور تو نہیں ہو جاتے بھائی جان۔

علی : ہاں، اتنا تو میں بھی جانتا ہوں۔

عالیہ : بس جانتے رہنے اور سوچتے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا بھائی جان۔

علی : ہاں! کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ نہ ہوگا۔

عالیہ : (ہنستی ہے) تو تم نجومی بھی ہو گئے بھائی جان۔

علی : (تنبیہ آمیز انداز میں) عالیہ!

عالیہ : (ہنستی ہے) ارے! تم تو خفا ہو گئے بھائی جان۔

علی : تم میرا مذاق اُڑا رہی ہو۔

عالیہ : (ہنستی ہے) تو ابھی کم سے کم تم اتنا محسوس کر سکتے ہو بھائی جان! یا اللہ...... تیرا شکر ہے۔ میں تو سمجھتی تھی............

علی : کیا سمجھتی تھیں؟

عالیہ : کہ شاید تم میں محسوس کرنے کی طاقت بھی نہیں رہی۔

[دُور سے آتی ہوئی ملی جلی آوازیں، ہلکا سا شور]

علی : (چونک کر) کچھ سنا تم نے؟

عالیہ : کیا؟

علی : شور۔

[شبراتی بھاگتا ہوا آتا ہے]

عالیہ : (گھبرا کر) کیا ہوا شبراتی...... کیا بات ہے؟

شبراتی : اماں بی۔

علی : (گھبرا کر) مصلّے پر بیٹھی دُعا مانگ رہی تھیں...... چکر آ گیا۔

عالیہ : اماں بی! اماں بی!

علی : اماں بی! کیا ہوا آپ کو اماں بی؟ رمضانی؟

رمضانی : جی چھوٹے صاحب۔

علی : پانی لاؤ۔

رمضانی : پانی تو یہ رکھا ہے چھوٹے صاحب!

علی : بنّو! میں اماں بی کا سر گود میں سنبھالتا ہوں۔ تم پانی لاؤ۔

عالیہ : مگر...... اس پانی میں تو عجیب سی مہک ہے۔

علی : دیکھوں تو...... ہونہہ! ہاں عجیب سی مہک ہے۔ (گھبراہٹ میں گلاس پھینک دیتا ہے۔) دُوسرا پانی لاؤ! اماں بی۔ اماں بی!

[رمضانی جاتا ہے، پھر آتا ہے۔]

عالیہ : اس پانی میں بھی وہی مہک ہے۔

علی : اوہ! لگتا ہے ان دونوں گلاسوں میں ماموں جان والا شربت...... ہونہہ...... گلاس دھوکر پانی لاؤ۔

[رمضانی جاتا ہے، پھر واپس آتا ہے]

عالیہ : اماں بی...... آنکھیں تو کھولیے اماں بی!

اماں بی : (بھرائی ہوئی آواز) مم...... مجھے...... کچھ بھی نہیں ہوا بیٹی۔ بس...... چکر سا آگیا تھا۔ تم دونوں فکر نہ کرو۔ اُٹھاؤ مجھے، سہارا دو...... ٹھیک ہے...... اب ٹھیک ہے۔

علی : آپ چل کر لیٹ جایئے اماں بی۔

[اماں بی کراہتی ہوئی، لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتی ہیں۔ ملے جلے قدموں کی چاپ جو دھیرے دھیرے دُور ہوتی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ حزینہ موسیقی کی ایک لہر۔]

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

[باورچی خانے کی کھٹ پٹ]

ممانی جان : (بڑبڑاتے ہوئے) توبہ ہے۔ لکڑیاں موئی ایسی گیلی ہیں کہ جلنا محال۔ کتنا کہتی ہوں، گیس کا چولہا منگوا لو۔ مگر وہی، مرغے کی ایک ٹانگ...... یہ کہ گیس پر جو کھانا پکتا ہے، بے مزہ ہوتا ہے۔ خیر، ہوگا...... مجھے کیا؟ کچا پکا جو ہو سکے گا، سامنے دھر دوں گی۔ ارے بیٹی سعدیہ، او سعدیہ۔

سعدیہ : (دُور سے) آئی ممانی جان! (آتی ہے)

ممانی جان : بٹیا ذرا دیکھو تو۔ آج تیسرا دن ہے۔ ایک روز کا کہہ کے گئی تھی جمیلن۔ ابھی تک غائب ہے۔ نمک حرام کہیں کی۔ (سعدیہ ہنستی ہے)

ممانی جان : (چڑ کر) ارے! تم تو لگیں ٹھٹھا لگانے۔ میں نے ایسی کون سی بات کہی تھی؟ تمیز تہذیب دُنیا سے رُخصت ہو گئی؟

سعدیہ : (ہنستے ہوئے) جمیلن کو نمک حرام تو نہ کہیے ممانی جان۔

ممانی جان : کیوں نہ کہوں؟ بھلا مجھے کون سا ڈر ہے؟

سعدیہ : (ہنستے ہوئے) وہ تو ٹھیک ہے ممانی جان، مگر ہمارے گھر کھانا جو بے نمک کا پکتا ہے۔

ممانی جان : اے بی بی! کچھ تو سوچ سمجھ کر بولا کرو۔ تمہارے بھلے کی جو بات تھی وہ بُری ہو گئی۔

سعدیہ : (ہنستی ہے)......................

ممانی جان : نمک موا خون میں فساد پیدا کرے ہے۔ وہ کہتے ہیں نمک کھانے سے آدمی مر جاتا ہے۔ دل کی بیماری آدبوچے ہے۔

سعدیہ : اور یہ جو دُنیا میں لاکھوں لوگ نمک......

ممانی جان : اے بی بی! دُوسروں کی بات پر نہ جاؤ۔ دُنیا میں تو لوگ حرام چیز کھا پی

کر بھی جیے جاتے ہیں۔ تو کیا ہم بھی سب کی لیک پر چلنے لگیں۔ اللہ نے ہمیں بھی تو عقل دی ہے۔ اپنے اچھے برے کا فیصلہ دوسروں کے کہے پر کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ خدا اُنہیں سلامت رکھے۔ کہتے ہیں آدمی منہ کے مزے کا غلام ہوا کہ کام سے گیا۔ بڑے بڑے صوفی، درویش، بزرگ پانی میں جو کی روٹی بھگو کر حلق سے اُتار لیتے تھے۔ آج دُنیا اُن کے نام کی مالا جپتی ہے۔ ہمیں دُنیا سے کیا لینا۔ ہم تو وہی کریں گے جو ہمارے لیے اچھا ہو۔

سعدیہ : اور ہمارے لیے اچھا یہی ہے کہ بے نمک کی غذا کھائیں جس سے خون میں فساد نہ پیدا ہو!

ممانی جان : اور نہیں تو کیا؟ خدا سلامت رکھے، اللہ نے اُنہیں جو رُتبہ دیا ہے تو یوں ہی نہیں دیا۔ کوئی تو بات اُن میں ایسی دیکھی ہوگی جو......

سعدیہ : (ہنستے ہوئے) ممانی جان! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔

ممانی جان : (برتن میں کفگیر چلاتے ہوئے) خیر چھوڑو بی بی۔ تم سے بحث کون کرے۔ لکڑیاں موئی جلنے کا نام نہیں لیتیں۔ دُھواں آنکھوں میں سوئی کی طرح چبھتا ہے۔ کتنا کہتی ہوں کہ گیس کا چولہا......

سعدیہ : ارے رے رے رے...... ممانی جان! یہ بھی تو سوچیے کہ گیس کے چولہے پر جو کھانا پکتا ہے، بے مزہ ہوتا ہے۔ ہے کہ نہیں!

ممانی جان : (زِچ ہو کر) سو تو ہے۔ مگر آسانی بہت ہوتی ہے بیٹی۔

سعدیہ : آسانی؟ آسانی کیوں؟ اس کی فکر آپ کا ہے کو کرنے لگیں؟ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے...... ہے کہ نہیں؟

ممانی جان : مگر یہ جمیلن گئی کہاں؟

سعدیہ : اپنے گاؤں چلی گئی ہوگی۔ کہتی تھی یہاں دَم گھٹتا ہے۔

ممانی جان : دَم گھٹتا ہے؟ کیوں؟

سعدیہ : (طنزاً) اب یہ نہ پوچھیے...... وہ چلی گئی۔ اس لیے کہ اسے کوئی روکنے والا نہ تھا۔ ہم نہیں جا سکتے، کیونکہ............

ممانی جان : ہاں ہاں، کہو، رُک کیوں گئیں؟

سعدیہ : کیونکہ بہت سی زنجیریں ہیں۔

ممانی جان : سعدیہ!

سعدیہ : بہت سی زنجیریں ہیں...... دُنیا کا ڈر...... اپنی بربادی کا ڈر...... اللہ کا ڈر!

ممانی جان : سعدیہ!!

سعدیہ : جس روز یہ دھاگہ ٹوٹا، سب کچھ بکھر جائے گا۔ کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ خون میں فساد پیدا کرنے کے لیے نمک کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔ فساد...... (رُک جاتی ہے)

[پاس آتی ہوئی قدموں کی چاپ]

اماں بی : سعدیہ...... تم یہ کیا بک رہی ہو؟

سعدیہ : اماں بی! [رونے لگتی ہے]

اماں بی : مت بھولو کہ دیواریں اونچی ہوں اور دروازے بند تو سر پر ایک کمزور سی چھت کا سایہ بھی بڑا سہارا ہوتا ہے۔

سعدیہ : اماں بی! [رونے لگتی ہے]

ممانی جان : باجی!

اماں بی : ہاں...... سن رہی ہوں تم لوگوں کی باتیں۔ بہت دیر سے سن رہی ہوں اور اب میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، چاہتی ہوں تم بھی سن لو۔

[سعدیہ کے رونے کی آواز]

اماں بی : یہ چھت ٹوٹ بھی گئی تو تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ آزاد ہو جاؤ گی؟ اور ایسا ہو بھی جائے تو کہاں جاؤ گی؟ کبھی یہ بھی سوچا ہے؟ کبھی یہ بھی سوچا ہے

کہ گھر کے باہر کتنی گھٹن ہے؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ چھت ٹوٹ گئی تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگیں گے؟

سعدیہ : اماں بی!

ممانی جان : (گلوگیر ہو کر) میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ زندگی کے جو دِن بھی پاس ہیں، خموشی سے گزر جائیں۔ اندر بہت شور ہے۔ باہر بھی بہت شور ہے۔ اس شور سے ڈرو...... سمجھیں یا نہیں! بہت شور ہے...... اس شور سے میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔

[ہیجان خیز موسیقی کی ایک لہر]

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

[حقے کی مسلسل گڑگڑاہٹ]

مکرم میاں : (باہر سے) ارے جناب چودھری صاحب! چودھری انوار الحق صاحب!

[چودھری صاحب کھانسنے لگتے ہیں]

چودھری صاحب : (پھنسی پھنسی آواز میں) کون؟ کون صاحب ہیں؟

مکرم میاں : یہ میں ہوں...... آپ کا نیاز مند...... مکرم علی!

محمد طفیل : اور یہ خادم محمد طفیل بھی حاضر ہوا ہے۔ اجازت ہو باریابی کی تو ہم اندر آجائیں۔

[چودھری صاحب حقے کا ایک لمبا کش لیتے ہیں۔]

مکرم میاں : (گلا صاف کرتے ہوئے) میں نے کہا......

چودھری صاحب : مکرم میاں! تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو، میں سمجھ گیا۔

[حقے کا ایک طویل کش لیتے ہیں۔]

محمد طفیل : (حیرت سے) واللہ؟ کیا واقعی؟

مکرم میاں : اے سبحان اللہ! اے سبحان اللہ!!

محمد طفیل : کیا دیدہ وری ہے۔ کیا صاحب نظری ہے۔

چودھری صاحب : (آہ بھر کر) اسی کا تو غم ہے عزیزو...... تم یہی کہنا چاہتے تھے نا کہ آج گھر میں بہت سناٹا ہے...... ہے نا؟

مکرم میاں : قسم غیب کا حال جاننے والے کی...... ایک دم یہی بات دماغ میں آئی تھی۔

چودھری صاحب : (اِترا کر) ہم سمجھ گئے تھے مکرم میاں۔ ہم سمجھ گئے تھے۔

محمد طفیل : حضور والا...... کہنے کو بندہ بشر ہیں...... مگر اہل خبر ہیں...... ہیں کہ نہیں!

چودھری صاحب : اب دبے ہوئے زخموں کو نہ کریدو محمد طفیل! تمہیں پتا ہے۔ دولہا بھائی کی وفات کے بعد میں نے اس گھرانے کو تباہی سے بچانے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ جو دُعا کی اس گھر کے مکینوں کی خوشی کے لیے، بہتری کے لیے، ترقی کے لیے۔

مکرم میاں، محمد طفیل : (ایک ساتھ) بے شک! بے شک!! حضور کی نیک اندیشی اپنی جگہ مسلم ہے۔

چودھری صاحب : (ڈپٹ کر) لیکن...... دیکھ لیا اس کا نتیجہ؟ گھر خالی ہوتا جا رہا ہے۔ افتخار چلا گیا۔ علی میاں بھی پر تول رہے ہیں۔ سب کہتے ہیں...... یہاں دَم گھٹتا ہے۔

مکرم میاں : دَم گھٹتا ہے؟ کیوں؟

چودھری صاحب : (اُداس لہجے میں) اُنہیں اس بات کا غم ہے مکرم میاں کہ گھر میں دم گھٹتا ہے۔ سوچو! میں نے دُولہا بھائی مرحوم کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھا۔ اُنہیں ہر بات کی آزادی دی۔ دن رات عبادت کریں۔ اپنی صحت

بنائیں۔ ہر بات کی آزادی۔ لیکن...... اور تو اور...... اُنہیں وہ شربت بھی اچھا نہیں لگتا جس کا نسخہ ابا مرحوم کی بیاض سے ملا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو مٹا دیا ان سب کے لیے۔

مکرم میاں : (لہک کر) مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے۔

محمد طفیل : (جلدی سے) کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے۔

چودھری صاحب : (اُداسی سے) ہونہہ...... مرتبہ......؟ مرتبہ سمجھنے سے ہوتا ہے اور یہ سب کے سب نا سمجھ ہیں۔ اب یہی دیکھو...... کل رات کوئی تین بجے آنکھ لگی...... اب اللہ جانے وہ خواب تھا کہ بیداری، ہم نے ایک عجب منظر دیکھا۔

محمد طفیل : (حیرت سے) بندر دیکھا؟

مکرم میاں : کیا دیکھا؟

چودھری صاحب : منظر دیکھا...... عجب منظر دیکھا...... دیکھا کہ ایک ویران بستی ہے۔ ہو کا عالم، آدم نہ آدم زاد، چرند پرند تک نہیں۔ سب کواڑ بند...... سب کھڑکیاں بند...... ہر دروازے پر قفل...... اتنے میں ایک آواز آئی۔

[فیڈ اِن]

[ہوا کا شور]

ایک آواز : ان سب کے مقدر کی کلید تیرے پاس ہے۔ اے بندے! اے صاحب عرفان! خود کو پہچان۔ یہ مہمان سرائے بد بختاں ہے، بن جا اِن کا نگہبان۔

[ہوا کا شور]

ایک آواز : اے مردِ خود آگاہ...... دکھا دے اس بستی کو نجات کی راہ۔ منہ سے کچھ

بول۔ بند دروازے کھول۔ ہر گھر تیرا گھر ہے۔ تجھے بھلا کس کا ڈر ہے۔
یہ تخت و تاج تیرا ہے۔ کل تیرا تھا، آج تیرا ہے۔
[ہوا کا شور]

[فیڈ آؤٹ]

مکرم میاں : سبحان اللہ...... سبحان اللہ!
محمد طفیل : ماشا اللہ...... ماشا اللہ...... پروردگار تیرا شکر ہے۔
چودھری صاحب : عزیزو! تم شکر ادا کرتے ہو اس کی عطا کا۔ مگر یہ سب کے سب ناشکرے ہیں۔ سنو، پھر کیا ہوا۔
مکرم میاں : کیا ہوا حضرت، کیا ہوا؟
چودھری صاحب : کیا دیکھتا ہوں مکرم میاں کہ ایک بڑی سی چابی، کسی نورانی دھات کی بنی ہوئی، جس کا مٹھ تلوار کے دستے سے مماثل تھا...... یکا یک کہیں سے میری جیب میں آ گئی۔ میں نے اس چابی سے ایک گھر کے دروازے پر پڑا قفل کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک تاجِ زریں نظر پڑا...... میں حیرت سے اُسے تکتا تھا کہ اچانک وہ تاج اُڑا اور میرے سر پر آ پڑا۔
مکرم میاں : سبحان اللہ۔
محمد طفیل : بشارت...... اے حضور بشارت!!
چودھری صاحب : تاج بھاری تھا۔ میرا سر چکرا گیا۔ آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سرہانے تپائی پر رکھی ہوئی صراحی لڑھک کر میرے بستر پر آ گری ہے۔ توشک بھیگ گئی۔
مکرم میاں : ہے ہے! کیا بشارت ہے...... توشک بھیگ گئی۔
چودھری صاحب : ہاں...... توشک بھیگ گئی، لیکن......!
محمد طفیل : لیکن کیا حضور؟

چودھری صاحب : (ٹھنڈی سانس بھر کر) اس بھید کو نہ تو تم سمجھو گے میاں مکرم، نہ طفیل میاں سمجھیں گے...... تو شک بھیگ گئی لیکن میرے لباس پر ایک قطرہ بھی نہیں پڑا۔ میرا سر داماں بھی ابھی تر نہ ہوا تھا۔

مکرم میاں : حضت! آپ مانیں نہ مانیں...... یہ سراسر کرامت ہے۔

چودھری صاحب : مگر اس گھر میں تو قیامت ہے۔ افتخار کہیں چلا گیا۔ علی بھی چلا جائے گا۔

محمد طفیل : (پُر خیال انداز میں) آج وہ، کل ہماری باری ہے۔

چودھری صاحب : (گلوگیر ہو کر) آپا...... اور عالیہ...... اور سعدیہ...... کوئی کچھ نہیں سمجھتا۔ (کھانسنے لگتے ہیں)

چودھری صاحب : (کھانستے ہوئے) شبراتی! عیدو! ارے کہاں ہو تم سب؟

رمضانی : (دُور سے) آیا صاب! (آتا ہے)

چودھری صاحب : (کھانستے ہوئے) پپ...... پ...... پانی!

رمضانی : پانی کہ شربت؟

چودھری صاحب : میرے لیے پانی...... مکرم میاں اور طفیل میاں کے لیے شربت۔

[وقفہ............ ایک موسیقی کی لہر...... رمضانی آتا ہے]

چودھری صاحب : (چونک کر) ایں! یہ کیا لائے ہو؟

رمضانی : کوکا کولا...... شربت کی بوتل پھوٹ گئی۔

چودھری صاحب : تو دُوسری تیار ہو جاتی۔ مجھ سے بتایا کیوں نہیں...... ایں؟

رمضانی : بڑی بی بی نے یہی کوکا کولا منگوائے دیا۔

چودھری صاحب : سب کے سب گمراہ ہوتے جا رہے ہیں۔ کسی کو کچھ لحاظ نہیں بزرگوں کے چلن کا۔ سب کے سب اپنے انجام سے بے خبر ہیں۔

مکرم میاں : اے صاحب نظر! انہیں ان کے حال پر چھوڑیے۔

محمد طفیل : گلا خشک ہو رہا ہے۔ اجازت ہو تو میں اسی ناپسندیدہ مشروب سے......

چودھری صاحب : (بیزاری سے) پی لو...... پی لو...... میرا کیا بگڑے گا۔

[اچانک بادل گرجتے ہیں........... ہوا کا شور]

چودھری صاحب : رُک جاؤ۔ (ہانپتے ہوئے) میاں محمد طفیل رُک جاؤ...... یہ اشارہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ بادل کی گرج! بجلی کی لپک! ہوا کا شور! طوفان کا زور! یہ زبان غیب ہے۔

[بادل گرجتے ہیں۔ اچانک ہوا طوفانی ہو جاتی ہے۔ لرزہ خیز موسیقی کی ایک لہر۔]

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

[اماں بی کی سسکیاں]

علی : (بھاری آواز میں، ضبط کی کوشش کرتے ہوئے) آپ سمجھتی کیوں نہیں اماں بی؟

[اماں بی کی سسکیاں تیز ہو جاتی ہیں۔]

عالیہ : اماں بی! اماں بی!

اماں بی : سب سمجھ سکتی ہوں۔ سب کچھ سمجھتی ہوں...... لیکن...... دل ٹوٹ جائے گا انوار کا...... وہ بیچارہ......

علی : ماموں جان...... اور بیچارے؟

عالیہ : (تنبیہ کے انداز میں) بھائی جان!

علی : اب پانی سر سے اوپر اُٹھتا جا رہا ہے۔ افتخار کی گمشدگی کو آج تیسرا دن ہے۔

عالیہ : (روہانسی ہوکر) بھائی جان!

علی : (اُسی رو میں) سعدیہ اپنا بیشتر وقت گھر سے باہر گزارتی ہے۔ اماں بی کی صحت گرتی جا رہی ہے۔

[اچانک پاس آتے ہوئے قدموں کی چاپ۔ ممانی جان اندر آتی ہیں]

عالیہ : چپ ہو جاؤ بھائی جان...... چپ ہو جاؤ۔

علی : اور تم سب اندر اندر اسی طرح گھلتی رہو۔ کھولتی رہو۔ اُبلتی رہو...... ذرا آئینے میں اپنی صورت تو دیکھو۔

ممانی جان : اے لو! بھیا ساری کرنی گئی بھاڑ میں۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی یہ چکر نہ پالو۔

علی : مگر کچھ لوگوں کو پالتو جانوروں کا شوق ہوتا ہے۔

اماں بی : (کپکپاتی ہوئی آواز میں) علی!

علی : اور جب انسانوں کا ریوڑ مل جائے تو......

عالیہ : (چیخ کر) بھائی جان!

(اماں بی کی سسکیاں)

ممانی جان : غضب خدا کا۔ دنیا سے چھوٹے بڑے کا لحاظ اُٹھ گیا۔ میں کہتی ہوں کیا ملا اتنا کچھ کر کے۔ دولہا بھائی مرحوم کی آنکھ بند ہوتے ہی انہیں یہ رٹ لگ گئی تھی۔ جیسے بھی ہو اس گھرانے کو ان مرحوم کی اُمیدوں کے مطابق پروان چڑھانا ہے۔ ہے ہے...... ان کے ساتھ میری بھی مت اُلٹ گئی تھی۔ یہ سب جی جان نچھاور کیے کا بدلہ ہے۔ دولہا بھائی مرحوم کی روح..........

علی : ممانی جان! آپ ابا جان مرحوم کی روح کو اس معاملے کے بیچ نہ لائیے۔

اماں بی : (کپکپاتی ہوئی آواز میں) علی بیٹے......علی......

علی : کہہ دیجیے کہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔ ہمارے لیے اتنا ایثار نہ

کریں۔ ہم معمولی لوگ ہیں۔ اتنی نیکیوں کا بوجھ نہیں سہار سکتے۔

ممانی جان : (اُچھل کر کھڑی ہو جاتی ہیں) میں جاتی ہوں۔ ابھی جاتی ہوں۔ اب اس گھر کا پانی بھی مجھ پر حرام ہے۔

علی : (طنزاً) اور وہ شربت؟

عالیہ : (چیخ کر) بھائی جان............ چلے جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ۔ خدا کے لیے چلے جاؤ۔

علی : گیا تو پھر لوٹ کر نہ آؤں گا۔

ممانی جان : تم کاہے کو جاتے ہو...... گھر تمہارا، در تمہارا۔ ہمارا کیا ہے! ہم چلے جاتے ہیں۔

[جانے لگتی ہیں]

عالیہ : (پکارتے ہوئے) ممانی جان! ممانی جان!!

ممانی جان : (دُور سے) ارے بٹیا...... اتنا کچھ سن لیا۔ اب اور سننے کی تاب نہیں ہے۔ (دُور جاتے ہوئے قدموں کی چاپ)

اماں بی : بُرا کیا تم نے علی...... بہت بُرا کیا۔ [رونے لگتی ہیں]

عالیہ : (گھبرا کر) ارے! اماں بی کو چکر آ گیا...... (پکارتے ہوئے) عیدو...... شبراتی...... رمضانی...... سعدیہ......

علی : (جھنجوڑتے ہوئے) اماں بی...... اماں بی............

[پاس آتے ہوئے قدموں کی چاپ]

عالیہ : سعدیہ! (رونے لگتی ہے)

سعدیہ : (گھبرا کر) کیا ہوا؟ کیا ہوا اماں بی کو؟

علی : اماں بی! اماں بی!!

عالیہ : خدا جانے یہ سب کہاں چلے گئے؟ عیدو...... شبراتی...... پانی لاؤ جلدی سے......

[پاس آتے ہوئے قدموں کی چاپ]

رمضانی : ہم آئے رہے ہیں بی بی.......... کا ہوا؟

علی : (چیخ کر) اب تک کہاں سو رہے تھے؟

رمضانی : بڑے سرکار نے حکیم اچھے صاحب کا پاس بھیجا تھا۔ کچھ جڑی بوٹی منگوائی تھی۔

علی : جڑی بوٹی؟

رمضانی : ہاں، شربت ختم ہوئی گیا تھا نا۔

علی : (چیخ کر) نکل جاؤ یہاں سے...... بھاگ جاؤ! دفعان ہو جاؤ۔ (چلا جاتا ہے۔)

اماں بی : (بھرائی ہوئی آواز میں) کتنا شور ہے بیٹے...... بہت شور ہے۔

سعدیہ : (جذباتی لہجے میں) اماں بی! اماں بی!!

اماں بی : (ڈوبی ہوئی آواز میں) مم...... میں...... میں یہ کیا دیکھ رہی ہوں! تم سب...... تم سب میرے پاس رہو...... اور افتخار...... ابھی تک نہیں آیا...... (ہچکیاں بندھ جاتی ہیں)

[پس منظر سے ہوا کا شور، اچانک بادل گرجتے ہیں جیسے دُور کہیں بجلی گری ہو۔]

سعدیہ : (چیخ کر) بھائی جان!

عالیہ : (چیخ کر) اماں بی!

علی : (بوکھلا کر) کک، کیا ہوا؟ کیا ہوا؟

[فیڈ اِن]

[شام کا وقت...... سناٹا...... دُور سے آتی ہوئی اذان کی آواز...... اللہ اکبر...... اللہ اکبر]

[فیڈ آؤٹ]

[دروازے پر لگاتار دستکیں]

مکرم میاں : طفیل میاں! کمال ہو گیا...... لگتا ہے سب کے سب سرِ شام ہی سو گئے۔

محمد طفیل : تمہارا ابھی جواب نہیں مکرم میاں۔ سنا نہیں، مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ ہوسکتا ہے سب کے سب نماز کے لیے گئے ہوں۔

مکرم میاں : نماز کے لیے؟ اماں عقل سیر کرنے تو نہیں چلی گئی؟ آخر مستورات تو ہوں گی گھر میں؟

محمد طفیل : ہاں۔ ہوں گی۔

مکرم میاں : مگر یہاں تو ایک دم سناٹا ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھو کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ کوئی نہ کوئی تو موجود ہوگا۔

[دروازے پر دستک دیتے ہوئے]

چودھری صاحب : (دُور سے) آرہا ہوں۔ آرہا ہوں۔

[پاس آتے ہوئے قدموں کی چاپ...... دروازہ کھلتا ہے۔]

مکرم میاں : سلام علیکم چودھری صاحب...... حضت! مزاج تو اچھے ہیں!

محمد طفیل : یہ خادم بھی آداب بجا لاتا ہے۔

چودھری صاحب : (بجھی ہوئی آواز میں) اوہ آپ ہیں۔ آیئے مکرم میاں! آؤ بھائی محمد طفیل۔ آؤ آؤ۔ وعلیکم السلام! اندر آجایئے آپ لوگ۔

[وقفہ]

مکرم میاں : یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں چودھری صاحب؟ نصیب دُشمناں آپ کا مزاج......؟

چودھری صاحب : ٹھیک ہوں، ٹھیک ہوں۔

محمد طفیل : حضور والا! کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟ ماتھے پر یہ سلوٹیں...... آنکھوں میں یہ ویرانی، ہونٹوں پر یہ بجھی بجھی سی مسکراہٹ، چہرے پر یہ

پیلاہٹ؟

چودھری صاحب : (جمائی لے کر) ٹھیک کہتے ہو عزیزو! اس ناچیز کی تربیت نے تمہیں بھی قیافہ شناس بنا دیا ہے۔

مکرم میاں : حضت، مناسب سمجھیں تو کچھ تفصیل بتائیں۔

چودھری صاحب : کیا بتائیں بھائی۔ آپا کے انتقال نے یہ گھر ہی ویران کر دیا۔ افتخار کا حال تم جانتے ہی ہو۔ آپا کے سویم کے روز عالیہ اور سعدیہ اور علی بھی رُخصت ہو گئے۔ کہاں گئے...... واللہ اعلم! رمضانی، عیدو، شبراتی کو اُس نابکار لونڈے نے پہلے ہی نکال دیا تھا۔ اور تو اور...... میری شریک حیات بھی...... یہ سب اُسی نابکار لونڈے کا کیا دھرا ہے۔

محمد طفیل : نابکار؟ لونڈا؟

چودھری صاحب : ارے سارا ہنگامہ اُسی کا برپا کیا ہوا ہے۔ میں نے سب سے زیادہ توجہ اس کی تربیت پر کی، لیکن خود کیا سدھرتا، دُوسروں کا دماغ بھی خراب کر دیا۔

مکرم میاں : چچ چچ...... ناقدر دانی اِسی کو کہتے ہیں۔

چودھری صاحب : عزیزو...... میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اس سے زیادہ کی مجھ میں سکت نہیں تھی۔

[بھاری قدموں کی چاپ، قریب آتی ہوئی۔]

چودھری صاحب : (چونک کر) ارے! تم ہو (خوفزدہ لہجے میں) تم پھر آ گئے۔ میں تو سمجھتا تھا...... (کپکپاتی ہوئی آواز میں) میں تو سمجھتا تھا...... تم ہمیشہ کے لیے دفعان ہو گئے یہاں سے۔

علی : میں اتنی آسانی سے کب چلا جاتا؟ ہونہہ؟

مکرم میاں : علی میاں!

محمد طفیل : (خوشامدانہ لہجے میں) چھوٹے میاں، چھوٹے میاں!

چودھری صاحب : (کانپتی ہوئی آواز میں) تت...... تم...... تم جاؤ...... تمہیں ہم
نے...... ہم نے آج سے آزاد کیا۔ جاؤ، چلے جاؤ...... چلے جاؤ۔ نہیں تو
یہ گھر ابھی ڈھے جائے گا...... جاؤ۔

علی : وہ لوگ جن کی روحیں ڈھے چکی تھیں، یہاں سے رُخصت ہوئے۔
(سرکش لہجے میں) چودھری صاحب! اب ہم آپ کو بھی یہاں سے لے
چلتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ در و دیوار ڈھے جائیں اور آپ...... آپ
بھی اس ملبے کا حصہ بن جائیں۔

[لرزہ خیز موسیقی]

چودھری صاحب : (گھبرا کر) بچاؤ، بچاؤ...... یہ چھت اب گرنے والی ہے۔

[علی کا طویل قہقہہ]

مکرم میاں : علی میاں! علی میاں!

محمد طفیل : چھوٹے صاحب...... چھوٹے صاحب!

چودھری صاحب : (بڑبڑاتے ہوئے) چھت گری، گری، گری، نن، نہیں گری، نہیں
گری، نہیں گری، گر گر گر گر مت، گر مت...... (گلا پھنس جاتا ہے۔
کھانسنے لگتے ہیں۔)

[لرزہ خیز موسیقی]

مکرم میاں : چودھری صاحب...... چودھری صاحب! وہ شربت کی بوتل کہاں رکھی
ہے؟ فرمایئے، فرمایئے۔

چودھری صاحب : گری گری گری...... نہیں گری نہیں گری نہیں گری...... [ایک طویل
قہقہہ، لرزہ خیز موسیقی]

[فیڈ آؤٹ]

OO

چوراہا

چوراہا

آوازیں :

(۱) چچا میاں	:	عارف اور آصف کے والد، بوڑھے، چالاک، دنیادار بزرگ
(۲) چچی امی	:	عارف اور آصف کی والدہ
(۳) عارف	:	جذباتی خواب پرست نوجوان
(۴) آصف	:	نوجوان، کالج کا طالب علم
(۵) مجن میاں	:	چچا میاں کے دوست، چرب زبان، گھاگ
(۶) ظہیر خالو	:	عارف اور آصف کے خالو
(۷) رحیمن	:	ملازمہ
(۸) مقرر		
(۹) قلی		

کمار گندھرو کی آواز میں کبیر داس کا بھجن، ''کون ٹھگوا نگریا لوٹل ہو۔''

فیڈ اِن :

[ابتدائی موسیقی...... دھیمی اور حزنیہ۔ فیڈ آؤٹ کے ساتھ ہی دُور سے چچا میاں کی آواز آتی ہے۔]

چچا میاں : آصف! او آصف!

آصف : (دُور سے) آ رہا ہوں۔ [بھاگتا ہے]

چچا میاں : (جھنجلا کر) آ رہا ہوں! لاٹ صاحب کہیں کے۔ کتنی بار کہا کہ بڑوں کو جواب اس طرح نہیں دیا جاتا۔

آصف : (دھیرے سے) جی!

چچا میاں : اب جی جی کیا کہہ رہے ہو۔ جب کوئی پکارے تو کہنا چاہیے ''حاضر ہوتا ہوں'' یہ کیا لٹھ مار جواب ہے...... ''آ رہا ہوں''...... ارے میاں تمیز تہذیب سب دُنیا سے رُخصت ہو گئی؟ اب تم لوگوں کو بھلے آدمیوں کی طرح بولنا آتا ہے، نہ اُٹھنا بیٹھنا۔

آصف : جی۔

چچا میاں : اور تمہاری چچی کیا کر رہی ہیں؟

آصف : بَبرچی خانے میں ہیں۔

چچا میاں : جاؤ...... کہو ہم اُنہیں یاد فرما رہے ہیں۔ ذرا پل بھر کو سن لیں۔

آصف : جی اچھا! (جاتا ہے)............ (دور سے) چچی امی! آپ کو چچا میاں بلا رہے ہیں۔

[دونوں آتے ہیں۔]

چچا میاں : (بگڑ کر) لاحول ولاقوۃ...... پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ ''چچا میاں بلا رہے ہیں۔'' تم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یاد فرما رہے ہیں؟ ہاتھ پاؤں گز بھر کے ہو گئے مگر بات کرنے کا سلیقہ نہ آیا۔

چچی امی : ہے ہے۔ میں کہتی ہوں ایسی کیا قیامت آگئی؟

چچا میاں : قیامت نہیں تو اور کیا ہے؟ سب تباہی کے آثار ہیں۔ چچا میاں بلا رہے ہیں...... ہونہہ!

چچی امی : تم بھی خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنائے دیتے ہو۔ میں کہتی ہوں ایسی کون سی چھت ٹوٹ پڑی۔ بچہ ہے، دھیرے دھیرے سیکھ جائے گا۔

چچا میاں : (طنزاً) جج جی ہاں۔ یہ لمڈھگ ہو گیا۔ ابھی بچہ ہی بنا ہوا ہے۔ اور عارف کہاں ہے؟

چچی امی : ہوگا کہاں! وہیں چھت پر۔ شام کا وخت ہے۔ کتنا کہا بیٹا دونوں وخت مل رہے ہوں تو یوں منہ چھپائے کمرے میں نہ پڑے رہا کرو۔ مگر اس پر اثر ہی نہیں ہوتا۔

آصف : کمرے میں نہیں ہیں بھائی جان۔

چچا میاں : پھر کہاں ہے؟

آصف : چھت پر۔

چچی امی : اے لو...... چھت پر کیا کر رہے ہیں؟ میں تو سمجھتی تھی کمرے میں گھسے پڑھ رہے ہوں گے۔

آصف : کیا کرتا رہتا ہے وہاں؟

آصف : آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ (ہنستا ہے)

چچا میاں : دماغ سنک گیا ہے کیا اُس کا۔ ہونہہ...... جاؤ، کہو میں بلا رہا ہوں۔

[آصف جاتا ہے۔]

چچی امی : اب تم ہاتھ دھو کے اس کے پیچھے نہ پڑ جانا۔

چچا میاں : افوہ......تم تو سمجھتی ہو میری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ میں بھلا اس کے پیچھے کاہے کو پڑوں گا۔ لیکن میں کہتا ہوں...... یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ آسمان کی طرف تکتا رہتا ہے۔ میں سب جانتا ہوں۔ کسی سے نظر بازیاں ہو رہی ہوں گی۔

چچی امی : اے لو......اب یہ ایک نئی بات نکالی تم نے۔

چچا میاں : تو کیا میں غلط کہتا ہوں؟

چچی امی : اور نہیں تو کیا؟ اپنا عارف ایسا نہیں ہے۔

چچا میاں : ایسا تو عارف کا باپ بھی تھا۔ یاد کرو۔ تم بھی تو روز شام کو چھت پر آجاتی تھیں اور میں اپنی چھت سے...... (ہنستے ہیں)

چچی امی : ختم کرو یہ چونچلے...... بوڑھے ہونے کو آئے......نوج۔

[عارف اور آصف کے قدموں کی چاپ۔]

چچا میاں : شش شی۔

[دونوں اندر آتے ہیں۔]

چچا میاں : تو میاں! یہ تم چھت پر کیا کرتے رہتے ہو؟

عارف : کچھ بھی تو نہیں، یوں ہی بیٹھا تھا۔

چچا میاں : میں بھی تو سنوں...... یوں ہی بیٹھے کیا کر رہے تھے؟

عارف : (کھوئی کھوئی آواز میں) پرندے...... پرندے لوٹ رہے تھے۔

چچا میاں : یہ دیکھو...... میں نہ کہتا تھا۔ پرندے...... پرندے...... آخر مطلب کیا ہے تمہارا؟

عارف : کچھ بھی نہیں چچا میاں۔

چچا میاں : لل لیکن...... پرندے؟

چچی امی : افوہ! چھوڑو بھی۔ تم تو بات کا بتنگڑ بنانے کے عادی ہو گئے ہو۔

چچا میاں : (ایک طویل سانس لے کر) اچھا خیر...... تو تم یہ کرو کہ آصف کو لے کر حکیم ابن صاحب کے پاس چلے جاؤ، میرا اسلام عرض کرنا، پھر کہنا کہ جو نسخہ اب تک چل رہا تھا، اس سے تو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔

عارف : مگر اسے دواؤں کی ضرورت ہی کیا ہے؟

چچا میاں : (بگڑ کر) تو تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو؟

چچی امی : ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔ ایسی کون سی بیماری اس کی جان کو لگی ہوئی ہے جو تم نسخے پر نسخہ گھول گھول کر پلائے جا رہے ہو۔ اے یہی نا کہ ذرا غائب دماغ رہتا ہے، بے چین ہے...... عمر کے ساتھ یہ بات جاتی رہے گی۔

چچا میاں : خدا کے لیے تم اِن باتوں میں ٹانگ نہ اَڑایا کرو۔ عارف! تم لے جاؤ اسے۔

عارف : جی اچھا۔

[دروازے پر دستک۔]

چچی امی : اے ذرا دیکھ تو بیٹا کون ہے۔ یوں کواڑ پیٹے جا رہا ہے۔ ہو نہ ہو، وہی مجن میاں ہوں گے...... اُٹھائی گیرے۔

[عارف جاتا ہے۔]

چچا میاں : (دھیرے سے) اری نیک بخت! تمھاری زبان کو کیا ہو گیا ہے۔ میں کہتا ہوں غریب گھڑی دو گھڑی کے لیے آ جاتے ہیں، میرا دل بھی بہل جاتا ہے۔

چچی امی : ہونہہ...... گھڑی دو گھڑی کے لیے! آتے ہیں تو بس چپک جاتے ہیں۔ اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

چچا میاں : (ٹالتے ہوئے) اچھا، تو تم یہ کرو کہ ذرا پان بنا دو۔ اور آصف تم ذرا حقہ تازہ کر دو...... اور عارف سے کہو کہ ذرا شطرنجی بھی بچھا دیں۔

چچی امی : ابھی تو حکیم صاحب کے یہاں جانے کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ اب سب کچھ چھوڑ کر موئی جوئے بازی کا چکر شروع ہو گیا۔ مجن میاں کا کیا ہے؟ جورو نہ جاتا، آوارگی سے ناطہ۔

چچا میاں : اے بی بی۔ کچھ تو سمجھو۔ تمہاری یہ بکواس اس غریب نے سن لی تو......

چچی امی : میں بکواس کر رہی ہوں؟

چچا میاں : (زِچ ہو کر) نن نہیں نہیں...... بیگم...... تم جو فرما رہی ہو...... سوچو تو گھر آئے مہمان کی توہین۔

چچی امی : تو اب وہ مہمان بھی ہو گئے۔ میں لاکھ برس یہ نہ ہونے دوں گی۔ مجھ سے یہ رت جگا نہ ہوگا۔ آدھی آدھی رات تک موئی بازیاں لگ رہی ہیں۔ چالیں چلی جا رہی ہیں۔ حقے کی گڑگڑی لگی ہوئی ہے۔ پان پر پان بنائے جا رہے ہیں۔ یہ سب کرنا ہے تو کہہ دو کہ اپنے گھر......

چچا میاں : (بگڑ کر) تو دروازے بند کر دوں۔ ٹکا سا جواب دے دوں۔ ساری بستی میں اپنی ہنسی اُڑواؤں کہ بڑے رئیس زادے بنتے ہیں اور گھر آئے مہمان کو......

چچی امی : میں کہتی ہوں وہ مہمان کب سے ہو گئے ہمارے؟ اُن کا گھر نہیں ہے؟

چچا میاں : اچھا تو ٹھیک ہے۔ میں ہی چلا جاتا ہوں ان کے گھر...... آجاؤں گا گھنٹے بھر میں۔

چچی امی : میں کہے دیتی ہوں۔ نہ تمہیں جانے دوں گی، نہ انہیں یہاں ٹکنے دوں گی۔ یہ گھر ہے، کوئی سرائے نہیں ہے۔ مسافر خانہ نہیں ہے۔ چوپال نہیں ہے...... سمجھے۔

[ملے جلے قدموں کی آواز قریب آتی ہے۔]

عارف : یہ ظہیر خالو آئے ہیں۔

چچی امی : (حیرت سے) ایں...... اررررر...... ظہیر میاں۔

چچا میاں : کک...... کون...... مجن میاں...... مجن میاں نہیں آئے...... ظظ...... ظہیر میاں۔

ظہیر خالو : (تنک کر) آتے ہی بے آبروئی ہوئی۔ میں واپس جاتا ہوں۔ رات مسجد میں کاٹ لوں گا۔

چچی امی : اے ہے...... تم سمجھو تو...... ہم اصل میں......

ظہیر خالو : جانے دیجیے آپا...... میں نے سب سن لیا ہے۔ یہ مسافر خانہ نہیں ہے، سرائے نہیں، چوپال نہیں، اب میں ایسا بے غیرت تو نہیں کہ......

چچا میاں : ارے بھائی...... یہ سب تمہارے لیے تھوڑے ہی کہا جا رہا تھا۔

ظہیر خالو : اب باتیں نہ بنایئے بھائی صاحب!

چچا میاں : یقین جانو...... واللہ...... وہ تو ایک اور صاحب ہیں، اُٹھائی گیرے۔ جب دیکھو وارد ہو جاتے ہیں۔ نہ دن دیکھیں نہ رات اور میں ٹھہرا مروت والا آدمی...... کوئی ؛ور تو منہ لگاتا نہیں۔

ظہیر خالو : کون صاحب ہیں؟

چچا میاں : ارے ہیں ایک صاحب...... بگڑے نواب...... مجن میاں۔

ظہیر خالو : وہی تو نہیں جو حسن پور کے تعلقہ دار تھے؟

چچی امی : ہاں ہاں! وہی...... تو تم اُنہیں جانتے ہو؟

چچا میاں : ارے شیطان کی طرح مشہور ہے وہ شخص۔ سنا ہوگا نام کسی سے۔ اس کی حرکتیں ہی ایسی ہیں۔ تمہاری آپا کو تو خدا جھوٹ نہ بلوائے اس کے نام سے نفرت ہے۔ یہ اسی کو سمجھ کر اول فول بک رہی تھیں۔

چچی امی : کیا کہا؟ اول فول بکیں میرے دُشمن۔

چچا میاں : ارے بھائی تم نے جو کہا سو فیصدی سچ کہا۔ میں خود اس شخص کی

صورت دیکھنے کا روادار نہیں ہوں۔ میرا تو بس یہ ہے کہ گھر کوئی بھی آجائے، کیسے دھتکار دوں اُسے۔

[دروازے پر دستک۔]

چچی امی : اے ہے...... بیٹا عارف، ذرا دیکھو تو پھر کوئی ٹپک پڑا۔ خدا جانے کون ہے؟

[عارف جانے لگتا ہے۔]

[وقفہ]

[عارف واپس آتا ہے۔]

چچا میاں : کون ہے؟

عارف : نواب مجن آئے ہیں۔

چچا میاں : مم مجن میاں...... مجن میاں۔ بٹھا دیا اُنہیں۔

چچی امی : آگئے پھر اپنی اوقات پر۔

ظہیر میاں : کیا بات ہے آپا جان...... میں تو کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔

چچا میاں : عارف...... بیٹے جاؤ بٹھاؤ اُنہیں دیوان خانے میں، اور حقہ...... اور بیگم تم ذرا پان......

چچی امی : سن رہے ہو ظہیر! ابھی اُن کے نام پر صلواتیں بھیجی جا رہی تھیں، اب آنکھیں بچھائی جا رہی ہیں۔

چچا میاں : اور ظہیر میاں ہاتھ منہ دھولو۔ کھانا میں ذرا دیر سے کھاتا ہوں۔ سمجھیں بیگم۔ عارف اور آصف کے ساتھ کھانا کھلا دو اِنہیں، بھائی معاف کرنا۔ میں ذرا دیکھ لوں۔ خدا جانے کس ضروری کام سے اِس وقت آگئے ہیں مجن میاں۔

چچی امی : ضروری کام؟ مجھے سب پتا ہے۔ وہ ضروری کام تم بھی دیکھ لینا اپنی آنکھوں سے ظہیر میاں۔

چچا میاں : اچھا تو میں ذرا دیوان خانے میں چلتا ہوں۔

[جاتے ہیں]

[موسیقی.......... منظر بدلتا ہے.......... موٹر کے ہارن، سڑک پر ٹریفک کا شور۔]

عارف : آصف۔

آصف : جی بھائی جان۔

عارف : یہ کھڑکی بند کر دو۔ شور بہت ہے۔

[کھڑکی بند کرتا ہے۔]

عارف : کیا ہوا؟ آج کوئی خط آیا گھر سے؟

آصف : جی، یہ ڈاک آئی ہے۔

عارف : (خط پڑھتے ہوئے) ہم لوگ اگلی جمعرات کو نکلیں گے۔ جمعہ کی صبح کو تمہارے پاس پہنچ جاویں گے۔ اسٹیشن یا تو خود آجانا یا پھر آصف کو بھیج دینا۔ نہیں تو مشکل پیش آئے گی۔ باقی سب خیریت ہے۔ ہاں، یہ خیال رہے کہ ہمارے ساتھ اسباب بہت ہوگا، اس لیے کسی یکّے والے سے بات کر لینا۔ (ہنستا ہے)

آصف : کیا ہوا بھائی جان؟

عارف : چچا میاں نے لکھا ہے کہ کسی یکے والے سے بات کر لینا۔ شاید وہ اسی گمان میں ہیں کہ یہاں یکے چلتے ہیں۔ جمعہ کی صبح کو آرہے ہیں۔ اسٹیشن تم چلے جانا، مجھے تو دفتر پہنچنے کی جلدی ہوگی۔ ویسے میں اس روز جلدی ہی لوٹ آؤں گا۔

آصف : جی اچھا۔

عارف : اور ہاں۔ چچا میاں کبوتروں کی جوڑی بھی تو لا رہے ہیں اپنے ساتھ۔ ان کا انتظام بھی کرنا ہے۔

[کال بیل بجتی ہے۔]

عارف : (دروازہ کھولتے ہوئے) ارے آپ مجن چچا۔

مجن میاں : ہاں میاں! کب سے تمہارا گھر ڈھونڈ رہا ہوں۔ پتا تو خیر میں نے تمہارا خط ملنے سے پہلے ہی لے لیا تھا۔

عارف : تو آپ آئے کب؟

مجن میاں : کوئی ہفتہ بھر ہوا۔

عارف : ٹھہرے کہاں ہیں؟ خیر اندر تو آیئے۔ (دونوں اندر آتے ہیں) تو آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟

مجن میاں : ایک ننہالی عزیز رہتے ہیں۔ وہ...... کیا نام ہے...... کرشنا کالونی میں۔ اُن ہی کے ساتھ قیام ہے۔ اب سوچ رہا ہوں اپنا کاروبار جماؤں۔

عارف : کاروبار؟ کیسا کاروبار؟

مجن میاں : وہ جو ہم سے چل سکے۔ یہ ٹیکسیوں کا کاروبار کیسا رہے گا؟

عارف : ٹیکسیاں؟

مجن میاں : ہاں۔ اگر دو گاڑیاں خرید لوں تو گزارا ہو جائے گا۔ میرے وہ عزیز بھی یہی کرتے ہیں۔ ان سے مشورہ کیا تو یہی سمجھ میں آیا۔ باہر ٹیکسیاں چلیں گی۔ ہم آرام سے گھر میں بیٹھے رہیں گے۔

عارف : (کچھ سوچتے ہوئے) گھر سے چچا میاں کا خط آیا ہے۔ وہ اور چچی امی جمعہ کی صبح کو آرہے ہیں۔ (ہنس کر) چچا میاں نے لکھا ہے کہ کسی یکہ بان سے بات کرلوں، اُنہیں اسٹیشن سے گھر لانے کے لیے۔

مجن میاں : جواب نہیں بھائی صاحب کا بھی۔ میں نے جب گھر چھوڑا تو کہتے تھے کہ شہر ہی اصل میں رہنے کی جگہ ہے۔ گاؤں میں اب رکھا کیا ہے؟ اور یہ بھی کہتے تھے کہ شہر میں سواری کے نام پر بسیں اور ٹیکسیاں چلتی ہیں۔ پھر یکے کا خیال اُنہیں کیسے آیا؟

عارف : وہ تو ٹھیک آیا مجن چچا۔ سب کچھ بھول جانا بھی اچھا نہیں۔

مجن میاں : ارے میاں دیکھنا! شہر آکر سب کچھ بھول جائیں گے۔

عارف : پرندے دن بھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ شام تک اپنے بسیروں کو لوٹ آتے ہیں۔ راستہ بھول تو نہیں جاتے۔

مجن میاں : (حیرت سے) پرندے؟ یہ پرندے اچانک کیسے یاد آگئے؟

عارف : (ہنس کر) چچا میاں کبوتروں کی ایک جوڑی بھی ساتھ لا رہے ہیں۔

مجن میاں : (حیرت سے) کبوتر؟ یعنی کہ کبوتر؟

عارف : ہاں! کبوتر...... وہ سفید کبوتروں کی جوڑی۔

مجن میاں : تو گویا کہ کبوتر بھی سفر کریں گے اُن کے ساتھ۔ ریل گاڑی میں۔

عارف : ہاں...... زمین کا سفر! اس میں حرج کیا ہے؟

مجن میاں : حرج کی تو کوئی بات نہیں۔ مگر یہاں اُن کا بندوبست۔

عارف : سب ہو جائے گا۔ جب چچا میاں یہاں رہ سکتے ہیں تو کبوتر بھی رہ سکتے ہیں۔

مجن میاں : (اُکتا کر) اچھا تو میاں میرا ایک کام بھی کر دو۔ ٹیکسیوں کا لائسنس......

عارف : اور ڈرائیور؟

مجن میاں : وہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے تو لائسنس ملنا چاہیے۔ موٹریں تو میں آج خرید لوں، سیکنڈ ہینڈ آسانی سے مل جاتی ہیں۔ جب سے پٹرول مہنگا ہوا ہے، لوگ دھڑا دھڑ اپنی گاڑیاں بیچ رہے ہیں۔ میرے وہ عزیز جن کے ساتھ میں ٹھہرا ہوا ہوں، شاید دو چار آدمیوں سے بات بھی کر چکے ہیں۔ کہتے تھے ہاتھ کے ہاتھ موٹریں مل جائیں گی۔

عارف : لائسنس میں بنوا دوں گا۔ اس دفتر میں میری بہت جان پہچان ہے۔

مجن میاں : اسی لیے تو تم سے کہہ رہا ہوں۔ تمہارا دفتر بھی تو اُسی بلڈنگ میں ہے۔

عارف : تو آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔ (ہنس کر) آپ شہر میں اجنبی نہیں

معلوم ہوتے۔

مجن میاں : اجنبی تو ہم دیہات میں بھی نہیں تھے۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ شہر کو سمجھنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ میں نے تو اپنے تعلقے کی بربادی سے اس آبادی کا بھید سمجھا ہے۔ اس آبادی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا بھائی۔ [ایک لمبی سانس بھرتے ہیں۔]

عارف : (کچھ سوچتے ہوئے) دیکھئے چچا میاں کا کیا حال ہوتا ہے۔ میں تو اب تک اس آبادی کو سمجھ نہیں سکا۔ سفر ٹھیک ہے، مگر صرف دن بھر کا۔ شام ہوتے ہوتے گھر لوٹ آنا چاہیے۔ جیسے پرندے لوٹ آتے ہیں۔

مجن میاں : (حیرت سے) پھر وہی پرندے...... پرندے۔ (پُرخیال انداز میں) مگر پھر مجھ میں لوٹنے کی خواہش کیوں باقی نہیں۔

عارف : شاید اس لیے کہ آپ کا کوئی گھر نہیں تھا۔ آپ ہمیشہ آرام سے رہیں گے مجن چچا۔ بربادی تو ہماری ہے۔

مجن میاں : (ہنستے ہیں) ارے میاں یہ تم کیا بہکی بہکی باتیں کرنے لگے؟

عارف : چائے منگواؤں آپ کے لیے؟

مجن میاں : چائے نہیں، کولڈ ڈرنک چل جائے گا۔

[پس منظر سے ہارن کی آواز، ٹریفک کا شور۔]

آصف : یہ کھڑکی بند کر دوں بھائی جان...... اپنے آپ کھل گئی۔

عارف : نہیں...... کھلی رہنے دو...... اور مجن چچا کے لیے کوکا کولا کی ایک بوتل لے آؤ۔

مجن چچا : خوب ٹھنڈی، ڈیپ فریز۔ (ہنستے ہیں)

[مضحکہ خیز موسیقی .... منظر بدلتا ہے۔]

[شام کا وقت۔ دُور مسجد سے اذان کی آواز سنائی دیتی ہے۔]

چچا میاں : (آموختے کی طرح پڑھتے ہوئے) آر۔ او۔ اے۔ ڈی۔ روڈ۔ روڈ معنے سڑک۔ ار۔ او۔ اے۔ ڈی۔ روڈ۔ آر۔ او۔ اے۔ ڈی............

چچی امی : (قریب آتے ہوئے) واہ بھئی واہ، بڈھے طوطے آسانی سے نہیں سیکھ سکتے۔ تم یہ کیا روڈ روڈ لگائے ہوئے ہو؟

چچا میاں : شہر میں رہنا ہے تو یہ سب سیکھنا ہوگا۔ دیکھ رہی ہو یہ نقشہ...... تمام سڑکوں، علاقوں اور تاریخی جگہوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔

چچی امی : (جھکتے ہوئے) اے ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ اپنا عارف کہاں رہتا ہے؟

چچا میاں : (پُراعتماد انداز میں) ابھی بتاتا ہوں...... یہ دیکھو...... یہ رہی کارنوالس روڈ یعنی کہ سڑک۔ اس کے پیچھے یہ رہا بی بی کا مقبرہ...... بس مقبرے کے پہلو میں عارف میاں کی بستی ہے۔

چچی امی : بستی کا نام کیا ہے؟

چچا میاں : نام تو کچھ بے ڈھنگا ہے...... سریندر پرتاپ کیو۔ لو۔ نی۔ کو۔ لو۔ نی۔ سمجھیں، کو۔ لو۔ نی کا مطلب ہے بستی...... نئی بستی ہوگی۔

چچی امی : چلو اچھا ہے۔ بستی میں گھر لیا۔ پاس پڑوس آباد ہوگا۔ مگر آبادی کس قوم کے لوگوں کی ہے؟ کچھ پتا چلا؟

چچا میاں : اب یہ تو اس نقشے میں نہیں لکھا ہے، مگر نام سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سریندر پرتاپ، وہ جو مڈل اسکول کے ایک ماسٹر صاحب ہمارے یہاں آتے ہیں۔ مہیندر پرتاپ...... وہ ٹھاکر ہیں۔ ہوسکتا ہے اس بستی میں زیادہ تر یہی لوگ آباد ہوں۔ شہر کا حال ہمارے یہاں سے بہت الگ ہے۔

چچی امی : الگ کیا؟ اے عارف کو گھر لینا تھا تو ایسی جگہ لیتا جہاں آس پاس

اپنوں کے گھر ہوتے۔ موت زندگی کا کیا بھروسہ۔ وقت نا وقت کوئی ضرورت آن پڑے......

چچا میاں : اسی لیے تو کہتا ہوں کہ تم ان معاملات میں حجت نہ کیا کرو......تم کیا جانو شہر کیا ہوتا ہے۔ وہاں چوڑی چوڑی روڈیں، کو۔ لو۔ نیاں...... یہ سب ہوتا ہے۔ عارف نے لکھا ہے۔ یکے تانگے کچھ قدیمی علاقوں میں چلتے ہیں۔ مگر وہ تو نئے علاقے میں رہتا ہے۔

چچی امی : اسٹیشن سے کتنی دُور ہے اُس کا گھر؟

چچا میاں : (نقشے پر جھکتے ہوئے) نقشے کے مطابق تو کافی دُور ہے۔ عارف نے لکھا تھا اسٹیشن سے گھر تک بس سے کوئی پون گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ قریب قریب اتنا ہی وقت جتنا ہمارے یہاں سے پرتاپ گڑھ شہر تک لگتا ہے۔

چچی امی : (حیرت سے) اللہ......شہر نہ ہوا ملک ہو گیا۔ بھلا آبادی کیا ہوگی اس شہر کی؟

چچا میاں : بھرا پورا شہر ہے۔ کچھ نہیں تو تیس چالیس لاکھ نفوس بستے ہوں گے۔

[دروازے پر دستک۔]

چچی امی : اے ذرا دیکھو تو......کون ہے...... بوا رحیمن......اے رحیمن!

رحیمن : (دُور سے) آئی بی۔ (آتی ہے)

[دروازے پر دستک۔]

چچی امی : اے ذرا دیکھو تو کون ہے؟

[جاتی ہیں، پھر آتی ہیں۔]

رحیمن : وہ سلطان میاں کا لونڈا تھا۔ کہہ گیا ہے کل ان کی بچی کا عقیقہ ہے۔ دن کے کھانے کا بلاوا ہے۔

چچا میاں : کھانا یعنی کہ دعوت۔ مم مگر...... یہ سب کیا فضول خرچیاں ہیں۔ ارے

بھئی وہ زمانے اب نہیں رہے جب بیس پچیس میں ایک فربہ جانور مل جاتا تھا۔ پتا ہے اب بکرے کا گوشت...... پندرہ روپے سیر بک رہا ہے۔ خیر بلایا ہے تو چلا جاؤں گا۔

چچی امی : اے گرانی سی گرانی ہے۔ بس آدمی کی جان سستی ہوگئی۔ سبزی ترکاری کے بھاؤ میں پہلے مرغ آجاتا تھا۔ دیسی گھی اب آنکھ میں لگانے کو بھی مہنگا ہے۔

چچا میاں : میں کہتا ہوں اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کم کھاؤ، معمولی کھاؤ۔

چچی امی : تمہاری ان ہی باتوں سے تو جی اُلجھتا ہے۔ ابا مرحوم کے زمانے تک گھر میں پانچ پانچ نوکر تھے۔ اب لے دے کے ایک رحیمن۔ روز کھانے پینے میں کیا اہتمام ہوتا تھا، اور اب بس پیٹ بھر لیا...... چوپایوں کی طرح۔

چچا میاں : تو اس میں بُرائی کیا ہے؟ کیا بزرگوں کی ساری کمائی اُڑا دوں، لٹا دوں، گنوا دوں سب کچھ۔ دیکھتی نہیں ہو! اب بھی حیثیت بنی ہوئی ہے۔ چار پیسے جیب میں ہیں تو دُنیا دبتی ہے۔ وجو بھائی کا بیٹا عرب چلا گیا تھا۔ وہاں اس کے کاروبار میں خدا نے برکت دی۔ اب وطن آتا ہے تو دونوں ہاتھوں سے لٹاتا ہے۔ اچھے بھلے طرم خاں جو بنتے تھے، اب اس کا حقہ بھرتے ہیں۔ اس کی مصاحبت میں رہتے ہیں۔

چچی امی : بھلا کیا کاروبار ہے اس کا؟

چچا میاں : وہ تو کچھ اور بتاتا ہے۔ مگر زبان خلق کچھ اور کہتی ہے۔

چچی امی : کیا؟ بھلا میں بھی تو سنوں۔

چچا میاں : تم نہیں سمجھوگی...... اسمگلنگ...... یہ ایک نئی وضع کا کاروبار ہے اور اس میں بڑی برکت ہے......بس ذرا پھنس جانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔

چچی امی : کہاں پھنس جانے کا؟

چچا میاں : یہی قانون کا ڈر (لاپروائی سے) مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ پیسا پاس ہو تو سب غلام...... قانون بھی غلام۔ لوگ ہاتھ لگاتے گھبراتے ہیں۔ دُنیا جانتی ہے کہ افیون بیچتے ہیں۔ دروازے پر موٹریں جھولتی ہیں۔ ملازموں کی بھیڑ ہے۔ اچھے اچھے سلامی دینے کو حاضر۔

چچی امی : (حسرت آمیز انداز میں) سچ ہے۔ پیسا ہی سب کچھ ہے۔

چچا میاں : کوڑی نہ ہو تو آدمی کوڑی کا تین ہو جاتا ہے۔ سمجھیں...... اسی لیے میں نے پھونک پھونک کر قدم رکھا۔ مجن میاں کو دیکھو۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ لنڈورے...... کوئی آگے نہ پیچھے...... مگر زمانے کا رنگ سمجھتے تھے۔ شہر چلے گئے۔ کہتے تھے کوئی کاروبار سنبھالیں گے۔ گھر کی جمع پونجی اُڑانے پر آتے تو دو چار برس میں سب کچھ ہوا ہو جاتا۔ پیسا تو پکڑنے سے رُکتا ہے۔

چچی امی : مگر تمہاری طرح بھی نہ پکڑے اسے کوئی۔ آدمی آرام سے کھا پی تو لے۔

چچا میاں : (بگڑ کر) ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تمہارے باوا جان نے اسی کھانے پینے کے چکر میں سب پھونک دیا نا۔ جہاں دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے اب مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔

چچی امی : (چمک کر) مکھیاں بھنبھنائیں ان کے دُشمنوں کے گھر، رئیسانہ جیے۔ سانپ لوٹتا تھا لوگوں کے سینے پر۔ جہیز میں گھر بھر گیا تھا تمہارا۔

چچا میاں : (مصالحت کے انداز میں) وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر بی بی...... میں کہتا ہوں آدمی کو آگے کی بھی کچھ فکر ہونی چاہیے۔ میں نے اگر یہ سب سنبھالا نہ ہوتا تو اپنا حال بھی وہی ہوتا جو ماموں صاحب کا ہوا۔ یہ سہی ہے کہ رئیسانہ جیے۔ مگر موت آئی تو گھر خالی تھا۔ عزیز رشتے دار بھی سب اچھے دنوں کے دوست ہوتے ہیں۔ سوائے ہمارے کسی نے مدد کی اُن کی؟

چچی امی : (روہانسی ہوکر) تم ہی نے کون سا خزانہ لٹا دیا۔ ابا جانی صبح ناشتے میں ایک مرغ کا شوربہ پیتے تھے۔ تم نے اُنہیں مہمان رکھا۔ جب بھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ ایک مرغ..........

چچا میاں : کیا مرغ مرغ لگا رکھا ہے۔ پتہ ہے کتنے کا آتا ہے۔ دس روپے کا تو چوزہ ملتا ہے۔

چچی امی : اور یہ جو اپنے یہاں پلے ہوئے تھے؟

چچا میاں : تو کیا سب کٹوا دیتا؟ اری نیک بخت۔ ایک مرغ سے عارف کی ایک مہینے کی اسکول کی فیس ادا ہو جاتی تھی۔

چچی امی : اور یہ حوصلہ نہیں ہوا کبھی کہ بچوں کو ایک آدھ بار کھلا بھی دیتے۔ لڑکپن میں عارف کی آنکھوں پر چشمہ چڑھ گیا۔

چچا میاں : تو کیا؟ چشمہ تو پڑھے لکھے ہونے کی نشانی ہے۔ تمہیں کچھ پتا بھی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین تک چشمہ لگاتے تھے۔ اور وہ مولانا محمد میاں صاحب۔ دیکھا ہے تم نے کیسی موٹی کمانی کا چشمہ چڑھائے رہتے ہیں۔ خیر...... اب یہ قصہ بند کرو اور یہ بتاؤ کہ کیا کیا انتظام کر لیے ہیں تم نے۔ دالوں کی بوریاں سی لیں؟

چچی امی : سی لیں؟ مگر اتنا اسباب جائے گا کیسے؟

چچا میاں : جائے گا کیسے نہیں؟ میں لے جاؤں گا۔ پتا بھی ہے شہر میں چھ روپے سیر بک رہی ہے۔ ایک بوری بیچ دوں تو سفر کا پورا خرچ نکل آئے۔

چچی امی : تو کیا اب دالیں بیچو گے؟

چچا میاں : اس میں حرج ہی کیا ہے؟ کچھ گھر کے لیے رکھ لیں گے، کچھ بیچ دیں گے۔

چچی امی : دُنیا کیا کہے گی؟ عارف کیا کہے گا؟

چچا میاں : جس کا جو جی چاہے، کہے۔ میں کسی سے دبتا ہوں؟ عارف کو کھلا پلا کر میں نے جوان کیا ہے۔ شہر پہنچ کر اگر ایسا ہی ان کا دماغ خراب ہو گیا

ہے تو وہ جائیں۔ گیہوں کے بورے بھی تیار ہیں نا...... اور ہاں......
ایک کنستر تیل، ایک ٹوکری کھٹائی اور دس پان سیر گڑ بھی رکھ لینا۔ بس
نمک، مرچ، سبزی، ترکاری کی محتاجی ہوگی...... وہ خرید لیں گے۔

چچی امی : یہ سب کر کے جاتے ہوئے اچھا لگے گا؟ لوگ کیا کہیں گے۔

چچا میاں : کہیں گے کیا؟ کوئی چوری کا مال ہے؟

چچی امی : ہمارے ابا جان نے کبھی چھتری بھی اپنے ہاتھ سے نہیں اُٹھائی۔ ایک خادم ساتھ ساتھ چلتا تھا۔

چچا میاں : اور ہمارے دادا حضور تو رومال بھی اپنی جیب میں رکھنے کے روادار نہ ہوتے تھے۔ جب چھینک آئی، ایک مصاحب رومال پیش کر دیتا تھا۔ پھر؟

چچی امی : پھر کیا؟ وضع داری بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

چچا میاں : بھاڑ میں گئی وضع داری۔ زمانے کو دیکھوں کہ ان چونچلوں کو؟ تمہیں کچھ پتہ بھی ہے۔ دلدارنگر کے تعلقہ دار کے گھر کی عورتیں اب چکن کی کڑھائی کر کے پیٹ پالتی ہیں۔

چچی امی : خدا نہ کرے۔ اب ایسے دن تو نہیں آئے ہم پر۔

چچا میاں : تمہاری سنتا تو یہ دن بھی آجاتے۔ آج جیب میں چار پیسے ہیں، اسی لیے یہ مان دان ہے۔ کلکٹر سے ملنے جاتا ہوں تو اُٹھ کر مصافحہ کرتا ہے۔ سرکاری اسپتال کا بڑا ڈاکٹر تھرمامیٹر دھوئے بغیر اس خاکسار کے منہ میں نہیں دیتا۔ ڈپٹی مزمل صاحب جب دورے پر اِدھر آتے ہیں تو وضو کا لوٹا اسی ڈیوڑھی سے منگواتے ہیں۔

چچی امی : اچھا صاحب! تم جیتے میں ہاری۔ اب زبان نہ کھولوں گی۔ جو جی چاہے کرو۔ اپنا کیا ہے۔ تین چوتھائی گزر گئی۔ باقی دو چار برس تقدیر میں ہیں تو وہ بھی گزر جائیں گے۔

چچا میاں : ہاں ہاں! بڑی مصیبتوں میں گزارے ہیں یہ دن تم نے۔

چچی امی : تم تو جان کو آ گئے۔ میں نے تو سب کچھ ہمیشہ چپ چاپ جھیلا ہے۔

چچا میاں : کیا جھیلا ہے؟ کہو جو جی میں ہو۔ ذرا سنوں تو!

چچی امی : اب مجھے کچھ نہیں کہنا۔ (روہانسی ہوکر) اب کیا کہوں گی۔ کہہ کر بھی کیا کرلوں گی۔ (رونے لگتی ہے۔)

[موسیقی.........فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

[باہر ٹریفک کا شور۔ دُور سے آتی ہوئی لاؤڈ اسپیکر پر کسی مقرر کی آواز۔]

مقرر : (جذباتی انداز میں) تو بھائیو اور بہنو! ہم آپ سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارا اُدیشیہ اس دیش کو آرتھک اور اودیوگک اُنتی دینا ہے۔ ہم چاہتے ہیں اس دیش کے کونے کونے میں، ہر گاؤں میں ہر نگر میں کارکھانے اور ملیں استھاپت ہوں۔ وگیان کی جیوتی گھر گھر پہنچے۔ ہم ایک نئی پرمپرا کو پروتساہت کریں۔ گریبی اور اندھ وشواس سے ہمیں چھٹکارا مل جائے۔ پشچم کے مہانگروں میں جو کھش حالی دکھائی دیتی ہے وہ گاؤں گاؤں میں پھیل جائے۔ ہم مل جل کر ایک نئے بھوشیہ کی اُور بڑھیں۔ [مقرر کی آواز تالیوں میں ڈوب جاتی ہے۔]

[اُسی وقت کال بیل بجتی ہے۔ اندر عارف ٹیپ ریکارڈر پر ایک گیت سن رہا ہے۔ دھیرے دھیرے باہر کی آواز ٹیپ ریکارڈر میں دب جاتی ہے۔ کال بیل پھر بجتی ہے۔]

عارف : آصف! اے آصف! ذرا دیکھو تو۔

[آصف جاتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور پھر مجن میاں اور آصف ساتھ ساتھ اندر آتے ہیں۔ عارف گیت سن رہا ہے۔]

مجن میاں : (کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے) بھئی واہ! میاں باہر اس زور وشور کی

تقریر ہو رہی تھی اور تم یہاں بکواس سن رہے ہو۔

عارف : تقریر؟

[ٹیپ ریکارڈر کی آواز دھیمی کر دیتا ہے۔]

مجن میاں : ہاں میاں! کیا شعلہ بیان مقرر تھا۔ کہتا تھا ہمیں اپنی تمام بیل گاڑیوں کو ٹرکوں میں تبدیل کرنا ہے۔ یکوں کی جگہ ملک کے کونے کونے میں ٹیکسیاں چلیں گی۔ کنوئیں کے غلیظ پانی کی جگہ سب کو نلوں کا پانی ملے گا۔

عارف : (پُر خیال انداز میں) کب تک؟ (ہنستا ہے) اور یہ سب پانے کے لیے جو کچھ کھونا پڑے گا، اس کا کسی کو خیال نہیں؟

مجن میاں : میاں گھاس تو نہیں کھا گئے ہو؟ یہ سب مل جائے تو پھر ضرورت ہی کس چیز کی رہ جائے گی؟

عارف : گاڑی بانوں کے گیت، اور پنگھٹ اور پٹرول کی بو اور دھوئیں سے آزاد فضا......

مجن میاں : اے میاں ہوش کی باتیں کرو، پڑھ لکھ کر اُلٹی منطقیں بگھار رہے ہو۔

عارف : یہ زمانہ ہی اُلٹی منطق کا ہے چچا۔ اُلٹی ترقی، اُلٹے آدرش، اُلٹی باتیں۔ خیر چھوڑیے اس قصے کو۔

مجن میاں : نہیں، ہرگز نہیں۔ تم مجھے قایل کر دو۔ مان جاؤں گا۔

عارف : میں بھلا آپ کو کیسے قائل کر سکتا ہوں۔

مجن میاں : کیوں؟ قائل کیوں نہیں کرتے؟

عارف : (ایک ٹھنڈی سانس لے کر) آپ عمر میں ہی نہیں، ہر معاملے میں مجھ سے آگے ہیں۔ [ٹیپ ریکارڈر بند کر دیتا ہے۔ باہر سڑک پر گزرتی ہوئی کسی موٹر کا ہارن چیختا ہے] اور شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں مجن چچا۔ میں ہی غلطی پر ہوں۔

مجن میاں : (خوش ہو کر) مان گئے نا۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ بھائی سائنس کا

زمانہ ہے۔ مشینوں، کارخانوں کا زمانہ ہے۔

عارف : ہاں! اور آدمی دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتا جا رہا ہے۔ جی ہاں! آدمی پیچھے ہٹتا جا رہا ہے۔

مجن میاں : (کھی کھی کھی کرتے ہوئے ہنستے ہیں) پیچھے! اماں تو کیا یہ ساری چیزیں آسمان سے ٹپکی ہیں؟ آخر خدا نے آدمی کو جو عقل کی دولت دی ہے، کیا یہ سب اس کا کرشمہ نہیں ہے؟

عارف : (ہنس کر) کرشمہ نہیں فتنہ کہیے۔

مجن میاں : دیکھو میاں! پھر تم نے بات ہنسی میں اُڑا دی۔

عارف : (سنجیدگی سے) یہی تو ستم ہوا مجن چچا کہ آدمی نے مشینیں بنائیں اور پھر اُن کا محکوم ہو گیا۔ خیر، جانے دیجیے، اپنی کہیے۔

مجن میاں : موٹریں تو خرید لیں...... دو عدد...... چالیس ہزار میں۔ بس معمولی اوور ہالنگ کی ضرورت ہے۔ اب تم لائسنس دلوا دو جلدی سے۔ آج دلوا دو، کل ہی سے چالو ہو جائیں گی...... میرے عزیز، وہی جن کے ہاں میں ٹھہرا ہوں، کہتے تھے کہ ڈرائیور بھی ہاتھ کے ہاتھ مل جائیں گے۔

عارف : تو آپ بھی اب ایک دم شہری آدمی بن گئے۔

مجن میاں : میاں یہ کہو کہ آدمی بن گیا۔ میری شامت کہ اتنے دنوں بعد ہوش آیا۔ یہ فیصلہ پہلے ہی کر لیا ہوتا تو آج کاروبار جم چکا ہوتا۔ خیر...... اب بھی کون سی دیر ہوئی ہے۔ میرے وہ عزیز دس برس پہلے شہر میں آئے تھے۔ موٹر مکینک بن گئے۔ پھر ٹیکسی ڈرائیور بن گئے، پھر اب ٹیکسیوں کے مالک ہیں۔ ایک نہ دو پوری چار گاڑیاں ان کے پاس ہیں اور چھ عدد اسکوٹر، رکشے۔ ٹھاٹھ ہیں۔ گاؤں میں تھے تو ایک گھوڑی پالنے کی حیثیت بھی نہیں تھی۔

عارف : (اُکتا کر) کل صبح آپ دفتر آ جائیے۔ خانہ پُری کا کام پورا ہو جائے،

پھر دیکھتے ہیں۔

مجن میاں : (رازدارانہ لہجے میں) میاں کچھ خرچ کرنے کی ضرورت آ جائے تو اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ یوں تو میں جانتا ہوں کہ تمہارے رہتے ہوئے اس کی ضرورت نہ پڑے گی۔ ماشاء اللہ تمہارے تعلقات افسروں سے ہیں۔ مگر تم جانو! پیسے کی ضرورت کسے نہیں ہوتی۔ پھر تنخواہ دار ملازم۔ گنی بوٹی نپا شوربہ...... کوئی کچھ مانگ ہی بیٹھے تو پیچھے مت ہٹنا۔ خدا کا دیا ہوا اپنی جھولی میں جو کچھ بھی ہے، کس دن کام آئے گا۔

عارف : (اُکتا کر) ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ آپ چائے پئیں گے؟

مجن میاں : چائے...... خیر چائے ہی پی لیں گے۔ اور لائسنس مل جائے تو پھر ایک شاندار دعوت...... کیا کہتے ہیں...... ڈنر...... لاؤ ہاتھ۔ (ہنستے ہیں)

عارف : (بیچارگی کے انداز میں) ٹھیک ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ (آصف سے) آصف، چائے بناؤ۔

مجن میاں : دیکھو بھائی، یہ غلط ہے۔ خود چائے بنانی ہے تو پھر نیچے دکان سے کوکا کولا منگوا لو۔ یہ تم کوئی ملازم کیوں نہیں رکھ لیتے؟

عارف : (ہنس کر) ملازم! آپ کو پتا بھی ہے ایک ملازم رکھنے پر کیا خرچ اُٹھے گا؟

مجن میاں : (سوچتے ہوئے) ہوں ں ں ں۔ یہ بات تو ہے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ میرے پارٹنر بن جاؤ۔ ایک موٹر اور خرید لیتے ہیں...... حساب کتاب میں دیکھوں گا۔ دفتر کچہری تمہارے ذمے۔ میرے عزیز کہتے ہیں اس کاروبار میں یہ چکر بہت ہوتا ہے۔

عارف : میں اس لائق کب ہوں مجن چچا۔ یہ ملازمت ہی بہت ہے۔ (آصف سے) آصف! مجن چچا کے لیے ڈرنک لے آؤ۔

آصف : جی اچھا۔

مجن میاں : اور بھائی صاحب اور بھابی صاحبہ کب آ رہے ہیں؟ کون سا دن بتایا تھا تم نے؟

عارف : جمعہ کی صبح کو......

مجن میاں : یعنی کہ پرسوں......نہیں......ترسوں۔

عارف : ہاں۔

مجن میاں : بھئی واہ! کل لائسنس مل جائے تو مزا آجائے۔ اپنی ٹیکسیاں لے کر اسٹیشن چلیں گے۔

عارف : آپ اس کی فکر نہ کیجیے۔ وہ انتظام ہو جائے گا۔

مجن میاں : (کھسیا کر) وہ تو ہو ہی جائے گا۔ مگر میں تو چاہتا ہوں اسی روز ہماری ٹیکسیوں کا افتتاح ہو جائے۔

[آصف کولڈ ڈرنک کی بوتل لے آتا ہے۔ مجن میاں کو دیتا ہے۔]

مجن میاں : صرف میرے لیے؟

عارف : ہم لوگ ابھی ابھی چائے پی چکے ہیں۔

مجن میاں : (ہنس کر) خیر، کوئی بات نہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم بھی بھائی صاحب کی طرح ذرا اقتصادی آدمی ہو۔

عارف : اقتصادی آدمی؟

مجن میاں : میرا مطلب ہے کفایت شعار۔ (ہنس کر) ارے بھائی۔ تنخواہ دار آدمی کو ہونا ہی پڑتا ہے۔ مہنگائی بھی تو غضب کی ہے۔ مکھن کی سو گرام کی ٹکیہ چار روپے کی۔ خدا کی پناہ (پھر ہنستے ہیں) مگر مکھن بازی کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ میاں اب تو نوکری میں بھی ترقی چاہیے ہو تو مکھن بازی کرنی پڑے گی۔

عارف : (بیزاری سے) معاف کیجیے گا مجن چچا۔ میں آج بہت تھکا ہوا ہوں۔

مجن میاں : ارے بھائی تو پہلے کیوں نہیں بتایا؟ خیر، میں چلتا ہوں۔ (اُٹھتے ہیں)

کل صبح ٹھیک دس بجے تمہارے دفتر میں حاضری دوں گا۔ (جاتے ہیں)

عارف : (خودکلامی کے انداز میں) اُلو کے پٹھے۔

آصف : آپ نے کچھ کہا بھائی جان۔

عارف : (چونک کر) نن نہیں۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔ [آصف چلا جاتا ہے۔]

عارف : (اپنے آپ سے) یہ کیسا تماشہ ہے۔ لوگ بدل جاتے ہیں...... یا بدلتے نہیں، بس بدلے ہوئے دِکھائی دیتے ہیں؟ یہ دوہری زندگی گزار رہے تھے؟ یا یہ کہ ان کا سفر ہمیشہ ایک ہی سمت میں ہوتا ہے...... آگے...... اور آگے...... اور آگے...... پرندے شام تک اپنے بسیروں کو لوٹ آتے ہیں۔ مگر یہ لوگ...... ہر صبح کے ساتھ اور آگے بڑھتے جاتے ہیں...... یہاں تک کہ واپسی کا خیال بھی ختم ہو جاتا ہے...... اس شہر میں کتنی سڑکیں ہیں، اور کتنے چوراہے...... اور ہر چوراہے سے نکلنے والی سڑک ایک دُوسرے چوراہے میں گم ہو جاتی ہے۔ یہ کیسا جال ہے...... ایک سلسلہ...... سازش...... راستوں کی سازش...... پورب، پچھّم، اُتر، دکھن...... اب کوئی سڑک اُن بستیوں کی طرف نہیں جاتی جہاں یکے چلتے ہیں اور دھول اُڑتی ہے اور جہاں کوئلیں کوکتی ہیں۔ وہ ساری کچی سڑکیں دھیرے دھیرے شہر کے راستوں میں گم ہوتی جاتی ہیں۔

[ٹیپ ریکارڈر آن کر دیتا ہے بھجن کی دھن اور بول رفتہ رفتہ نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔]

کون ٹھگوا نگریا لوٹل ہو
کون ٹھگوا نگریا لوٹل ہو
جگ سے ناتا ٹوٹل ہو
کون ٹھگوا............

[فیڈ آؤٹ]

[منظر بدلتا ہے]

[اسٹیشن کا شور...... گاڑی آتی ہے۔ شور...... اسی شور کے پس منظر میں۔]

چچا میاں : بھئی واہ...... مجن میاں بھی یہیں ہیں۔

مجن میاں : جناب! عارف میاں کی کوششوں سے لائسنس مل گیا۔

چچا میاں : لائسنس؟

مجن میاں : جی جناب۔ دو ٹیکسیوں کا۔ یہ خاکسار خدمت کے لیے حاضر ہے۔ آپ کو اپنی ہی گاڑی پر گھر لے چلیں گے۔

عارف : آپ لوگوں کا سفر تو اچھا رہا؟

چچا میاں : ہاں بیٹے! بس تمہاری چچی ذرا نڈھال ہو گئیں۔ سفر لمبا تھا، مگر لمبا بھی کتنا۔ ایک رات۔

عارف : آپ تو لگتا ہے پورا گھر یہاں اُٹھا لائے۔

چچا میاں : بھائی گھر کی چیزیں تھیں۔ ہم نے سوچا لیتے چلیں۔

عارف : اور وہ کبوتروں کی جوڑی؟

چچا میاں : اوہ...... ہاں، پہلے تو سوچا تھا۔ مگر پھر خیال آیا کہ اُلجھن رہے گی۔ ظہیر میاں کے سپرد کر آیا۔

مجن میاں : اچھا ہی کیا آپ نے! یہاں کبوتروں کا کیا ذکر، آدمی کے لیے جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ دو کمروں کا فلیٹ ہے عارف میاں کا۔

چچا میاں : میاں اب آ گئے ہیں تو سب جھیل جائیں گے۔ رفتہ رفتہ عادت پڑ جائے گی۔ یہ اچھا ہے کہ تم بھی ہو۔ شام کو شطرنج بچھے گی۔

مجن میاں : (ہنس کر) اب خلیل خاں کے فاختہ اُڑانے کا زمانہ گزر گیا بھائی صاحب۔ جب سے آیا ہوں لگتا ہے مرنے کی بھی فرصت مشکل ہی سے ملے گی۔ ایسی بھاگم بھاگ ہے کہ کیا بتاؤں۔ مگر سچ پوچھیے تو یہی زندگی ہے۔

عارف : (اُکتا کر) اب آگے بڑھیں۔ گھر چل کر باتیں ہوں گی۔ (پکارتے ہوئے) قلی! او قلی!

چچا میاں : عارف میاں، کچھ ہم بھی اُٹھا لیتے ہیں۔

عارف : پھر بھی، کم سے کم تین قلیوں کی ضرورت پڑے گی۔

چچا میاں : آج تمہاری چھٹی ہے؟

عارف : جی نہیں! پہلے تو سوچا تھا آصف کو بھیج دوں۔ مگر اچانک اسے ایک مصروفیت نکل آئی۔ میں نے آج چھٹی لے لی۔ (قلی سے) تم...... تم یہ گٹھر اُٹھاؤ...... آیئے۔

چچا میاں : دیکھو...... کچھ چھوٹ تو نہیں گیا؟

مجن میاں : ہاں میاں! اچھی طرح گن لو...... ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھے، چھے عدد تو قلیوں کے ساتھ ہیں۔ یہ سامان ایک ایک دو دو ہم اُٹھا لیتے ہیں...... چلو۔

[اسٹیشن کا شور غالب آجاتا ہے۔]

[فیڈ آؤٹ]

[موسیقی........... منظر بدلتا ہے۔]

چچا میاں : (کھانستے ہوئے) ارے بھئی سنتی ہو! ارے بھئی میں نے کہا سنتی ہو؟

چچی امی : (دُور سے) آرہی ہوں۔ آرہی ہوں۔ (بڑبڑاتے ہوئے قریب آتی ہیں) تمہاری تو عادت ہے گلا پھاڑنے کی۔ دو بالشت کا گھر، یہاں اس کی ضرورت کیا ہے؟ کیا ہے؟ کس واسطے چیخ رہے تھے؟

چچا میاں : ٹھیک سے بیٹھو تو کہوں۔

چچی امی : (بیٹھ جاتی ہیں۔)..........

چچا میاں : ہفتہ بھر ہو گیا آئے ہوئے۔

چچی امی : مجھے معلوم ہے...... پھر؟

چچا میاں : پُر رونق شہر ہے۔

چچی امی : (اُسی انداز میں) وہ تو دیکھ رہی ہوں...... پھر؟

چچا میاں : عارف نے گھر بھی اچھی جگہ لیا ہے۔ رات گئے تک چوراہہ آباد رہتا ہے۔ وہاں کتنا سناٹا تھا۔ سرِ شام ہی بستی پر مردنی چھا جاتی تھی۔

چچی امی : (کچھ سوچ کر) مگر مجھے تو یہاں ہول اُٹھتا ہے، جی اُلجھتا ہے۔

چچا میاں : اصل میں گھر چھوٹا ہے ذرا۔

چچی امی : تو بدل لو۔

چچا میاں : بدل لوں، مگر کیسے؟ عارف کی تنخواہ............

چچی امی : عارف کی تنخواہ پر ہی بھروسہ کیوں ہے؟ خدا کا دیا ہوا......

چچا میاں : (بات کاٹ کر) اگر اسے ابھی سے اُڑانا شروع کر دیا تو کتنے دن کام چلے گا؟

چچی امی : پھر چپ بیٹھو۔

چچا میاں : (پُر خیال انداز میں) ہوں ں ں ں...... میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔

چچی امی : کیا؟

چچا میاں : یہ کہ کیوں نہ کوئی کام سنبھال لوں۔

چچی امی : تمھیں یہاں کون سی نوکری مل جائے گی۔ پھر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔

چچا میاں : ضرورت......ضرورت کیوں نہیں۔ تو کیا عمر بھر اس گھروندے میں بند رہیں۔ ذرا دیکھو۔ چاروں طرف کیسی کیسی شاندار عمارتیں ہیں۔ ابھی کل ہی میں مجیب میاں کے گھر گیا تھا آصف کو لے کر۔ یہاں سے کوئی چار پانچ میل کے فاصلے پر جار ٹاؤن نامی بستی میں رہتے ہیں۔ اپنی کوٹھی بنوا لی ہے۔ ارے وہی مجیب میاں مراد آباد والے۔

چچی امی : پھر؟

چچا میاں : پھر کیا؟ وہ مرادآبادی برتن اور بھانت بھانت کی فینسی چیزیں ولایت بھیجتے ہیں۔ ہزاروں کی یافت ہے۔ دسیوں تو ان کے کارندے ہیں۔ خدا نے بڑی برکت دی۔

چچی امی : پھر؟

چچا میاں : افوہ! تم تو بس پھر پھر لگائے ہوئے ہو۔ میں سوچتا ہوں میں بھی یہی کام شروع کر دوں۔ ایکسپورٹ لائسنس لینا ہوگا۔

چچی امی : ایکسپورٹ.......... کیا کہا؟ کیا لینا ہوگا؟

چچا میاں : سرکاری اجازت نامہ سمجھو۔ میں نے ساری معلومات جمع کر لی ہیں۔

[کال بیل بجتی ہے۔]

چچا میاں : یہ ناوقت کون آمرا؟ آصف ابھی تک آیا نہیں اور عارف کیا کر رہا ہے؟

چچی امی : دُوسرے کمرے میں لیٹا ہے۔ عارف...... او عارف...... ذرا دیکھو تو بیٹا کوئی ہے۔

[عارف دروازہ کھولتا ہے۔ مجن میاں اندر آتے ہیں۔]

عارف : (باہر سے) مجن چچا ہیں۔

چچا میاں : تم ہٹ جاؤ...... مجن میاں آئے ہیں۔

[چچی امی دُوسرے کمرے میں جاتی ہیں۔]

چچا میاں : آؤ آؤ بھائی مجن میاں...... خوب آئے ہیں۔

مجن میاں : آداب عرض بھائی صاحب۔

چچا میاں : آداب عرض...... تسلیمات...... آؤ آؤ۔

[مجن میاں بیٹھ جاتے ہیں۔]

چچا میاں : عارف...... بیٹے تم بھی بیٹھو، ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔

عارف : جی اچھا............ (بیٹھ جاتا ہے)

چچا میاں : (رازدارانہ انداز میں) کل میں مجیب میاں کے گھر گیا تھا نا آصف کے ساتھ۔

عارف : جی۔

چچا میاں : ماشاءاللہ کیا شاندار کاروبار جمایا ہے۔ کوٹھی کیا ہے محل ہے محل۔ بڑے بیٹے کو امریکہ بھیج دیا ہے۔

عارف : جی۔

مجن میاں : امریکہ...... بہت خوب...... صاحب امریکہ کی بھی کیا بات ہے۔ فسٹ نمبر ہے اس ملک کا۔

چچا میاں : سوچتا ہوں آصف کو بھی بھیج دوں۔ کیوں عارف؟

عارف : بہت اچھا ہے۔ مگر ابھی اس کا جانا...... دو سال بعد ہی ٹھیک ہوگا۔

چچا میاں : دو سال کیوں؟

عارف : ایم۔اے۔ کا کورس پورا ہونے میں دو سال لگیں گے۔

چچا میاں : ارے میاں کیا رکھا ہے ایم۔اے۔ میں؟ کتنا کما لے گا ایم۔اے۔ کر کے؟

مجن میاں : ٹھیک کہتے ہیں بھائی صاحب! کیا رکھا ہے ایم۔اے۔ میں؟

عارف : میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔

چچا میاں : میں وہی تو سمجھا رہا ہوں میاں تمہیں۔ وہ مجیب میاں مرادآبادی برتنوں کا ایکسپورٹ کرتے ہیں، سمجھ لو عیش کرتے ہیں۔ بڑے بیٹے کو بھی اسی کاروبار میں لگا لیا ہے۔ پہلے تو بس وہ سال دو سال پر وہاں جاتا تھا اور اپنے سامان کا آرڈر لاتا تھا۔ اب وہیں بس گیا ہے۔ وہاں دُکان کھول لی ہے۔

عارف : تو آصف کیا کریں گے وہاں؟

چچا میاں : ارے میاں کوئی ابھی تھوڑے ہی بھیجے دے رہا ہوں۔ ابھی تو پہلے یہاں کاروبار جمانا ہے۔ پھر خدا نے چاہا تو وہ دن بھی آجائے گا۔

مجن میاں : (جلدی سے) جب ہمارے آصف میاں امریکہ جا بسیں گے۔

چچا میاں : انشاءاللہ العزیز......

مجن میاں : اور سچ پوچھئے تو آپ کی حیثیت بھی......

چچا میاں : (جلدی سے) بھائی مجن میاں...... حیثیت تو بنانے سے بنتی ہے۔ مانا کہ مجیب میاں گھر کے کھاتے پیتے آسودہ حال تھے مگر اب تو دولت کی ریل پیل ہے۔ دیکھتے دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ جب وہ کر سکتے ہیں تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔

مجن میاں : انشاءاللہ انشاءاللہ......

چچا میاں : تو بیٹے عارف!

عارف : جی!

چچا میاں : ایکسپورٹ لائسنس بنوانے کا جگاڑ کرو!

مجن میاں : ارے بھائی صاحب، یہ تو عارف میاں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ ماشاءاللہ سے وسیع تعلقات...... پھر ذہانت، فطانت، متانت، بس ذرا محنت کرنی پڑے گی۔

چچا میاں : میں نے سب معلومات یکجا کر لی ہیں۔ (رازدارانہ انداز میں) مجیب میاں کا ایک پرانا کارندہ بھی واقف کار نکلا۔ واقف کار کیا، سمجھو کہ لنگوٹیا یار تھا۔ اس کے باپ میں اور میرے تایا مرحوم میں بڑا یارانہ تھا۔ تایا مرحوم کے گھر جب بھی جاتے، میں اور وہ خوب دھومیں مچاتے۔ پاس پاس حویلیاں تھیں اور کارندہ بن کے رہ گیا غریب۔ باپ نے ساری دولت جائیداد ناعاقبت اندیشی میں اڑا دی۔ وہ تو کہو کہ دو حرف پڑھ لیے تھے جو آج کارندہ بھی بن گیا ہے...... نہیں تو......

مجن میاں : (آہ بھر کر) ہاں بھائی صاحب...... دُنیا بڑی بے اعتبار جگہ ہے۔

چچا میاں : تو پھر عارف میاں...... تم کل ہی سے بھاگ دوڑ شروع کر دو۔ خدا نے چاہا تو اپنے آصف میاں بھی ایک روز امریکہ پہنچ جائیں گے۔

مجن میاں : اُن سے ایک مسالہ پیسنے کی مشین منگوانی ہے مجھے۔ صاحب امریکیوں کا بھی جواب نہیں۔ کیا چیزیں بناتے ہیں۔ آصف میاں سے کہوں گا کہ......

چچا میاں : (جلدی سے) ارے بھائی پہلے وقت تو آنے دو۔ سب کچھ منگوا لینا۔ ٹیلی ویژن، ٹرانزسٹر، ریڈیو گرام...... مجیب میاں کے یہاں کیا کیا عجائبات جمع ہیں۔ میری تو آنکھیں کھل گئیں۔

مجن میاں : جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی...... کیا بات کہی ہے شاعر نے موقع کی۔

چچا میاں : ارے صاحب! (پُر جوش انداز میں) اسی لیے تو آج رشیا بھی امریکہ کا لوہا مانتا ہے۔ ویسے رشیا بھی بہت آگے جا چکا ہے۔ اپنی کتیا تک چاند پر بھیج دی۔ دونوں میں خوب لاگ ڈانٹ رہتی ہے۔ کیوں بیٹے...... ہے نا؟

عارف : جی! (رُک کر) تو میں چائے بنوا دوں آپ دونوں کے لیے۔

چچا میاں : ارے میاں بیٹھو تو دو گھڑی۔ میں چاہتا ہوں بات آج طے ہو جائے۔

مجن میاں : طے کیا کرنا بھائی صاحب! پیسہ ہاتھ میں اور دماغ ذرا چلتا ہو تو کاروبار جمنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ مجھی کو دیکھئے۔

چچا میاں : تمھیں کتنی یافت ہو جاتی ہے روزانہ؟

مجن میاں : کم سے کم ڈیڑھ سو۔

چچا میاں : گویا ڈیڑھ سو کو تیس سے ضرب دو تو...... کتنا ہوا؟ کتنا ہوا...... ساڑھے چار ہزار؟

مجن میاں : (اِترا کر) جناب!

چچا میاں : (مرعوب ہو کر) کمال ہے بھئی۔ ساڑے چار ہزار۔ تو کیوں نہ میں ٹیکسیوں ہی کا کاروبار جما لوں؟

مجن میاں : ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ اور چاہیں تو کسی چلتی ہوئی چیز کی ایجنسی لے لیں۔

چچا میاں : اِجنسی...... یہ کیا چیز ہے؟

مجن میاں : مگر اس میں پہلے دُکان کے لیے جگہ کا چکر ہوگا۔

چچا میاں : جگہ تو مل ہی سکتی ہے۔ مگر یہ اجنسی کیا بلا ہے؟

مجن میاں : یہ سمجھ لیجیے کہ جیسے کارخانے ہیں۔ چیزیں تیار کرتے ہیں۔ صابن ٹوتھ پیسٹ، پلاسٹک کی چیزیں، یا جیسے بلب، پنکھے، ریڈیو...... ہزاروں چیزیں ہیں۔

چچا میاں : ہاں ہاں...... سمجھ رہا ہوں۔ پھر؟

عارف : (اُکتا کر) میں چائے بنوا دوں؟

چچا میاں : ہاں ہاں...... جاؤ! جب تک میں مجن میاں کی بات سنتا ہوں...... ہاں تو جیسے بلب، ریڈیو، پنکھے، ہزاروں یعنی کہ ہزاروں چیزیں ہیں۔

[عارف اُٹھتا ہے اور باہر نکل جاتا ہے۔]

چچا میاں : اور بیٹے...... ذرا چار مینار سگریٹ کی ایک ڈبیا بھی منگوا دو۔

عارف : (باہر سے) جی اچھا۔

[پس منظر سے ٹریفک کا شور اُبھرتا ہے۔ اس شور کے ساتھ لرزہ خیز موسیقی کی ایک لہر اُبھرتی ہے، پھر ڈوب جاتی ہے۔]

[وقفہ]

[فیڈ اِن]

چچی امی : بیٹے آصف!

آصف : جی چچی امی!

چچی امی : یہ عارف دفتر سے لوٹ کر کمرے میں بند ہو جاتا ہے۔ پہلے شام کو کھلی ہوا میں چھت پر بیٹھتا تھا۔ اب جب دیکھو کمرے میں......

آصف : تو کیا بلا دیں اُنہیں؟

چچی امی : نہیں...... آرام کرنے دو۔ مگر آخر بات کیا ہے بیٹے؟

آصف : یہاں کھلی چھت تو ہے نہیں۔

چچی امی : پھر کہیں باہر ہی ہو آیا کرے۔ گھڑی دو گھڑی دوستوں میں ہنس بول لے۔ میں اُسے کسی کے ہاں آتے جاتے کبھی نہیں دیکھتی۔

آصف : (متانت سے) بھائی جان بس اپنے ساتھ رہتے ہیں اور شاید ٹھیک ہی کرتے ہیں۔

چچی امی : ایں؟

آصف : جی کچھ نہیں۔

چچی امی : کمرے میں بند کیا کرتا رہتا ہے؟

آصف : گیت سنتے رہتے ہیں۔

چچی امی : یہ نیا شوق لگا ہے اسے۔ گاؤں میں تو یہ شوق نہیں تھا۔

آصف : وہاں پرندے تھے۔ (دھیرے سے) اور خاموشی۔

چچی امی : ایں......؟ کیا کہا؟

آصف : تھک جاتے ہیں دن بھر۔ بھائی جان کا مزاج ہی کچھ دُوسرا ہے۔

چچی امی : میں تو سمجھتی ہوں اس کا جی یہاں لگتا نہیں۔ چپ چپ تمہارے باوا اب کاروبار کی دھن میں لگ گئے ہیں۔ مجن میاں اپنے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ عجیب افراتفری ہے۔ سب پیسے کے غلام۔ یا اللہ یہ کیسی ہوس ہے؟

[کال بیل بجتی ہے۔]

آصف : (چلا کر) آیا...... حاضر ہوا۔ (جاتا ہے)

[دروازہ کھلتا ہے، چچا میاں اندر آتے ہیں۔]

چچا میاں : (ہانپتے ہوئے) آج تو جان ہی لے لی اس چکر نے۔ (بیٹھ کر کھانستے ہیں) ذرا پانی لاؤ بیٹے۔

آصف : جی اچھا! [جاتا ہے، پھر آتا ہے]

چچی امی : کچھ کھالو تو پانی پیو۔

چچا میاں : نہیں! بھوک قطعاً نہیں۔ دن میں وہیں دفتر کے سامنے ایک اسٹال پر...... وہ کیا کہتے ہیں...... دو چھولے بھٹورے کھا لیے تھے۔ مزے کی چیز تھی۔ (ہانپتے ہوئے) خیر خدا کا شکر ہے کہ کام آدھا تو ہو گیا۔

چچی امی : مگر ایسا بھی کیا کام کہ آدمی ہلکان ہو جائے۔

چچا میاں : (غٹ غٹ پانی پیتے ہیں) ارے دیکھ لینا۔ خدا نے چاہا تو سال دو سال میں کاروبار چمک اُٹھے گا۔ میں تو کہتا ہوں بس ذرا چل نکلے تو آصف کو امریکہ بھیجتا ہوں۔ ایک چکر تو لگا ہی آئے۔ اور کاروبار کا تو یہ ہے کہ اشرف صاحب...... وہی جن کے یہاں مجیب میاں کا سمدھیانا ہے...... کسی زمانے میں بندر پکڑوا کر ولایت بھیجا کرتے تھے۔ خدا نے اس میں برکت دے دی۔ اب اچھا خاصہ چڑیا گھر جما لیا ہے۔ سانپ، بچھو، مینڈھک، بندر، چوہے، خرگوش، مچھلیاں...... قسم قسم کے جانور بیچتے ہیں۔

چچی امی : سانپ، بچھو، بندر، چوہے، مینڈھک، یہ خریدتا کون ہے؟

چچا میاں : تم کیا جانو...... بڑے بڑے اعلا کالجوں بلکہ یونیورسیٹیوں میں ان کی کھپت ہے۔ طلبہ طالبات ان پر عجب تجربات کرتے ہیں، چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ جبھی تو ڈاکٹر بنتے ہیں۔ کیوں آصف؟

آصف : جی۔

چچا میاں : میں نے مرادآبادی برتنوں کا ارادہ چھوڑ دیا۔ سوچتا ہوں کپڑے سلوا کر باہر بھجواؤں۔

چچی امی : کس کے کپڑے؟

چچا میاں : لوگوں کے پہننے کے لیے...... تم کیا جانو...... گارمینٹ ایکسپورٹ کا بہت چلن ہے ان دنوں۔ کوئی درجن بھر درزی تو اپنی ہی طرف کے یہاں لگے ہوئے ہیں۔ میں نے سب پتا کرلیا ہے۔

چچی امی : یہ دن بھر جو مارے مارے پھرتے رہتے ہیں، تو کیا............

چچا میاں : (جھنجلا کر جلدی سے) تم اسے مارا مارا پھرنا کہتی ہو۔ مجھے لائسنس بھی مل گیا۔ اب دیکھنا، بس دو چار دنوں میں............ کیوں آصف؟

آصف : جی!

چچا میاں : عارف میاں ہیں کہاں؟ دفتر سے تو آ گئے ہوں گے۔

آصف : کمرے میں ہیں۔ بلا لاؤں؟

چچا میاں : ہاں ہاں بلاؤ۔ ذرا اُن سے مشورہ تو کروں۔

[آصف جاتا ہے، پھر آتا ہے۔]

چچی امی : کیوں...... کیا ہوا؟

آصف : بھائی جان شاید کہیں چلے گئے ہیں۔ آس پاس کہیں چلے گئے ہوں گے کسی ضرورت سے۔

چچی امی : کب نکل گیا چپکے سے؟ خبر بھی نہیں ہوئی۔

آصف : میں نے کچھ آہٹ تو سنی تھی۔ مگر دھیان نہیں دیا۔

چچا میاں : چلے گئے ہوں گے کہیں گھومنے پھرنے۔ اچھا ہے، آجائیں گے ابھی...... بچے تھوڑی ہیں۔

[کال بیل بجتی ہے، آصف دروازہ کھولتا ہے۔ ملے جلے قدموں کی آوازیں قریب آتی ہوئی۔]

آصف : (باہر سے) مجن چچا ہیں۔

چچا میاں : بھئی واہ، خوب آئے...... بیگم تم اندر جاؤ۔ (چچی امی جاتی ہیں) آؤ

بھئی مجن میاں آؤ۔ موقعے سے آئے۔

مجن میاں : آداب عرض بھائی صاحب۔

چچا میاں : آداب...... کتنے دنوں بعد صورت دِکھائی۔

مجن میاں : کیا کہوں بھائی صاحب۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔ کئی منصوبے ہیں۔ ان ہی کی اُدھیڑ بن میں لگا رہتا ہوں۔ پھر فاصلے......

چچا میاں : تمہارا گھر بھلا کتنی دُور ہوگا یہاں سے؟

مجن میاں : کم سے کم دس میل۔ خدا کا شکر ہے، گھر اچھا مل گیا۔

چچا میاں : خدا کا شکر ہے۔

مجن میاں : سوچا دو چار کرسیاں پلنگ ڈال لوں۔ گھر گرہستی کے انتظام میں کوئی اور تو ہاتھ بٹانے والا ہے نہیں۔

چچا میاں : ہو جائے گا۔ سب ہو جائے گا۔ (آصف سے) بیٹے آصف! ذرا چائے بنوا دو۔

آصف : جی اچھا! (جاتا ہے)

چچا میاں : بھائی میں نے ایک اور بات سوچی ہے۔ وہ مرادآبادی برتنوں کا کام بعد میں سوچیں گے۔

مجن میاں : پھر؟

چچا میاں : سوچتا ہوں گارمینٹ ایکسپورٹ......

مجن میاں : (جلدی سے) بہت خوب...... بہت خوب...... کیا بات آئی ہے ذہن میں۔ اس میں بڑی برکت ہے۔

چچا میاں : ہاں بھائی! بڑی برکت ہے۔ خدا نے چاہا تو چل نکلے گا۔

مجن میاں : میرے پڑوس میں ماتھر صاحب رہتے ہیں۔ اتفاق سے یہی کاروبار ہے اُن کا۔ اپنا کارخانہ ہے...... کم سے کم بیس تو کاریگر ہیں۔

چچا میاں : بیس عدد...... یہ تو کچھ بھی نہ ہوئے۔ میاں میں تو آج ایک ایسا

کارخانہ دیکھ کر آیا ہوں جہاں کم سے کم سو کاریگر رہے ہوں گے۔

مجن میاں : سو کاریگر......؟

چچا میاں : ہاں! سو کاریگر! یقین مانو...... باخدا۔

مجن میاں : کمال ہے۔

چچا میاں : تو سوچ رہا ہوں کہ یہ کام ٹھیک رہے گا۔ چل نکلا تو آصف کو......

مجن میاں : (جلدی سے) امریکہ...... ہاں صاحب! امریکہ کی کیا بات ہے۔

چچا میاں : اصل میں محنت کی جائے تو ہر جگہ کامیابی ہے۔ پیسا پیسے کو کھینچتا ہے۔ خدا کے فضل سے اتنا تو ہے ہی۔ سوچتا ہوں وہ آموں والا باغ جو گھر کے پاس ہے، اسے بھی فروخت کر آؤں۔

مجن میاں : بیچ دیجیے۔ کیا رکھا ہے اس میں؟

چچا میاں : خیر یہ تو نہ کہو۔ ایک سے ایک لاجواب پھل ہوتا ہے۔ تمہیں یاد ہے، کہاں کہاں سے قلمیں منگوائی تھیں؟ دربھنگہ، ملیح آباد، شاہ آباد، کلکتہ، پورا ملک چھان مارا تھا۔ ہر فصل میں کیا بہار آتی تھی۔

مجن میاں : وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر...... اس سے یافت کیا ہوتی تھی؟

چچا میاں : یہ تو ہے۔ زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار۔ اصل میں ہماری طرف ریلوے اسٹیشن بن گیا ہوتا تو بات بنتی۔ بیل گاڑی پر آم ڈھونا حماقت ہے۔

مجن میاں : وقت بہت لگتا ہے صاحب...... اور یہ زمانہ!

چچا میاں : اور نہیں تو کیا۔ میرے وہ ماموں زاد بھائی ہیں نا، سخاوت میاں...... ان کا جے سنگھ پور والا باغ بس اڈے سے قریب تھا۔ خوب آمد و رفت ہوتی تھی۔ پھل ہمارے باغ سے کچھ کم ہی ہوتے تھے۔ مگر یافت، ہم سے پانچ گنا۔ گھر بھر لیا۔ دو دو تو ٹریکٹر خرید لیے۔ چار چار ٹیوب ویل لگوا لیے۔ کوٹھی کھڑی کر لی۔ حد تو یہ ہے کہ موٹر بھی خرید لی۔ مگر اسی دکھاوے کے چکر میں خرچ بھی کیا بے حساب......

مجن میاں : ہوں......تو آپ کب شروع کر رہے ہیں؟

[آصف چائے لے کر آتا ہے۔]

چچا میاں : لاؤ بیٹے! محسن میاں یہ لو۔ چائے پیو بھئی...... اور آصف...... بیٹے تم بھی بیٹھو۔ ذرا طے کرلیا جائے معاملہ۔ اچھا ہوا کہ مجن میاں بھی آ گئے۔ ان کا دماغ خوب چلتا ہے ان باتوں میں۔

مجن میاں : (ہنس کر) مگر آپ سے کم بھائی صاحب۔ خدا کی قسم...... جائے اُستاد خالی است۔

چچا میاں : بھائی کہاں کی اُستادی۔ کچھ چل نکلے کام تو بات بھی ہے۔ خیر...... تو......

[دُور سے آتی ہوئی سائرن کی آواز۔ اچانک رُکتے ہوئے۔]

چچا میاں : کیا وقت ہوا ہے؟ ذرا دیکھو تو گھڑی۔

آصف : نو بجے ہیں......نو بج کر پانچ منٹ۔

چچا میاں : ایں......نو بج کر پانچ منٹ......اور عارف میاں اب تک لاپتا ہیں۔

مجن میاں : کہاں گئے ہیں آخر؟

چچا میاں : خدا جانے۔ آصف بیٹے...... ذرا کھڑکی سے جھانک کر دیکھو تو۔ چوراہے پر کہیں کھڑے تو نہیں ہیں۔

آصف : (کھڑکی کا پٹ کھولتا ہے۔ ٹریفک کا دبا دبا سا شور سنائی دیتا ہے۔] بھائی جان کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں۔

چچا میاں : کسی سڑک پر نہیں...... دیکھو شاید کسی طرف سے آ رہے ہوں۔

آصف : (ذرا رُک کر) نن نہیں...... جی نہیں۔ نہیں دکھائی دیتے۔

مجن میاں : کمال ہے؟ کہاں رہ گئے؟

چچا میاں : ہاں، عجیب بات ہے۔ کہاں تو ہر وقت کمرے میں گھسے رہتے تھے...... کہاں آدھی رات تک غائب۔

مجن میاں : نو بج کر دس منٹ ہونے کو ہیں۔

چچا میاں : آصف...... ذرا اندر دیکھو، پوچھو تو۔

آصف : جی اچھا۔

[باہر نکل جاتا ہے...... وقفہ...... واپس آتا ہے۔]

چچا میاں : کیوں...... کچھ پتہ چلا؟

آصف : بھائی جان آگئے...... اندر ہیں۔

چچا میاں : کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟

آصف : نہا رہے ہیں......

چچا میاں : نہا رہے ہیں......؟ اس وقت؟

آصف : جی! دیر سے نہا رہے ہیں...... چچی امی کہتی ہیں بہت دیر سے نہا رہے ہیں۔

(حزینہ موسیقی کی ایک لہر اُبھرتی ہے...... پھر بہت دھیرے دھیرے ڈوب جاتی ہے۔]

[ڈراپ]

OO

دیوار

دیوار

آوازیں :

(۱) چمپا : نوکرانی

(۲) شانتی : عمر چالیس کے لگ بھگ، جذباتی لہجہ

(۳) راج : شانتی کا دیور، عمر شانتی کے آس پاس

(۴) رائے صاحب : شانتی کے سسر، بوڑھے

(۵) گیتا : شانتی کی دوست، ہم عمر

(۶) سانیال صاحب : رائے صاحب کے دوست

(۷) ....ایک آواز............

[ابتدائی موسیقی...... راگ مالکوس کے اونچے سروں میں ایک گیت]

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

[رات کا سناٹا...... ہوا کا شور...... طوفان...... لگتا ہے بیچ بیچ میں سیٹیاں سی بجتی ہیں...... دُور کہیں کھڑکی کے پٹ اچانک کھلتے ہیں...... اُڑتے ہوئے کاغذوں کی پھڑ پھڑاہٹ...... کانچ کے ٹوٹنے کی آواز۔]

ایک آواز : (دُور سے آتی ہوئی، گونجیلی اور بھاری)

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

فیڈ آؤٹ

[ہوا کا شور...... قریب آتے ہوئے قدموں کی چاپ...... دروازے پر دستک]

چمپا : مالکن............ مالکن......؟

شانتی : کون؟ چمپا؟ کیا بات ہے؟

چمپا : (گھبرایا ہوا لہجہ) جھکڑ چل رہے ہیں مالکن...... ابھی...... ابھی اچانک کیسی آواز آئی تھی؟ کہیں کوئی دیوار گری ہے......؟

شانتی : دیوار؟ (رُک کر) نہیں...... جاؤ...... تم سو جاؤ...... میری چنتا مت کرو۔ (دروازہ بند کر لیتی ہے)

[موسیقی کی ایک لہر.......... ہوا کا شور]

شانتی : (ہانپتے ہوئے) پاگل، پریشان ہوا...... یہ کسے ڈھونڈ رہی ہے؟ دُور تک پھیلا ہوا، گھنا، گمبھیر اندھیرا...... موت کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ...... اوف...... اوف...... یہ کیسی بے کلی ہے؟ اور...... اور ایسا کیوں ہوتا ہے کہ دیواروں سے ٹکراتی ہوئی ہوا کی ایک لہر...... سب کچھ بکھیر دیتی ہے؟

[ہوا میں پھڑ پھڑاتے ہوئے کاغذ...... دُور سے آتی ہوئی ایک دیوانہ وار قہقہے کی گونج]

شانتی : (ہانپتے ہوئے) یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں اچانک بکھرتی کیوں جا رہی ہوں؟ یہ کیسی اُلجھن ہے؟ سانسوں میں رچی ہوئی یہ کیسی مہک ہے؟ گئے دنوں کی؟ (اچانک کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے)

[فیڈ آؤٹ.......... وقفہ]

[صبح کا تاثر...... پرندوں کے چہچہے]

شانتی : تم کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو راج؟

راج : (چونک کر) اوہ...... مادام شانتی لتا؟ تو تم...... دُوسروں کی سوچ کے بارے میں بھی پریشان ہو سکتی ہو؟ کیوں؟

شانتی : بکومت...... میں نے پریشان ہونا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے تو یاد بھی نہیں کہ کبھی میں پریشان تھی...... اور ہوتی بھی تو کیوں؟

راج : دیکھئے مادام! اپنے آپ کو دھوکا دیتے رہنا، مانا کہ اچھی عادت ہے، مگر

اس سے ملتا کیا ہے؟

شانتی : (بگڑ کر) دیکھو راج...... یہ سائیکو انالائسس کا چکر چھوڑ دو۔ اچھائی جو کچھ بھی ہوتی ہے، دِکھائی دیتی ہے...... دیکھو...... میں کتنی سکھی، کتنی شانت دِکھائی دیتی ہوں۔ ہے کہ نہیں؟ (ہنستی ہے)

راج : (رُک کر) دیکھو بھابی...... وہ بھکاری...... دھنی رام...... جو ہر شام الفریڈ پارک کے گیٹ پر کھڑا دکھائی دیتا ہے...... اس کا نام دھنی رام ہے...... اور وہ بھکاری ہے...... سمجھیں؟ ٹھیک ہے، تم مسز شانتی لتا ایم۔ اے۔، پی۔ ایچ۔ ڈی۔...... مگر یہ شانتی صرف تمہارے نام میں ہے...... ہے کہ نہیں۔

شانتی : تو کیا...... سچ مچ، میں تمہیں اشانت اور بے چین دِکھائی دیتی ہوں؟

راج : ہاں کہہ کر میں اِس دیوار کو توڑنا نہیں چاہتا جو تم نے اپنی آتما کے چاروں اور چن رکھی ہے۔

شانتی : (تنبیہ کے انداز میں) راج!

راج : (دھیمے لہجے میں) سن رہا ہوں...... اور تمہارے پاس ہی بیٹھا ہوا ہوں۔

شانتی : (بڑبڑاتے ہوئے) دیوار! دیوار!! دیوار!!!

[فیڈ اِن]

[مندر میں بجتی ہوئی گھنٹیاں...... شنکھ...... دُور سے آتی ہوئی کیرتن کی دھمی دھیمی آواز۔]

شانتی : دیکھو...... ادھیڑ عمر کی وہ عورت...... وہ سفید ساری میں...... اس کا نام سندھیا ہے...... کیرتن منڈلیوں کے ساتھ، پچھلے پچیس برسوں سے وہ

اسی طرح منجیرہ بجاتی رہتی ہے۔ اور...... اور راج! تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ ہم دونوں، ایک ہی بستی میں جنمے تھے۔ دس بارہ برس کی عمر تک ہم ساتھ کھیلتے تھے...... بنوں میں اور کھیتوں میں...... پھر اس کا بیاہ ہو گیا تھا اور اس کا پتی مر گیا تھا...... سانپ نے کاٹ لیا تھا اسے۔ پھر اسے سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ پھر وہ اپنے مائکے بھی نہیں آئی تھی کیونکہ اس کا پتا کا دیہانت ہو چکا تھا اور وہ گھر والے اُسے سویکار کرنے کو تیار نہیں تھے۔ (ہانپنے لگتی ہے)

راج : (پُکارتے ہوئے) بھابی...... بھابی...... (گھبرا کر) بھابی......!

شانتی : پھر...... وہ پریاگ چلی آئی تھی...... اور جب سے اب تک وہ اِسی مندر میں کیرتن منڈلیوں کے ساتھ اسی طرح بیٹھی منجیرہ بجاتی رہتی ہے۔ اُس نے مجھے ابھی دیکھا تھا، مگر پہچانا نہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اُس نے مجھے پہچاننے سے اِنکار کر دیا...... وہ مجھے پہچاننے سے ڈرتی ہے...... اور میں...... میں بھی اُسے پہچاننے سے ڈرتی ہوں۔ تم یہی سوچ رہے ہو نا! کیوں؟

راج : یہ تم...... اچانک تم کیسی باتیں کرنے لگیں؟

شانتی : (کھلکھلا کر ہنستی ہے) میں نے تمہارے من کا چور پکڑ لیا نا؟ مگر...... مسٹر راج ونش! ایک بات گرہ میں اچھی طرح باندھ لو...... میں اُسے پہچاننے سے ڈرتی نہیں...... یہ اور بات ہے کہ میں اُسے پہچاننا نہیں چاہتی۔

راج : کیوں؟

شانتی : اس لیے کہ اُسے پہچاننے کا مطلب اُن بھولے بسرے دنوں کو یاد کرنا ہے جو میرے لیے اب کوئی بھاؤ، کوئی اَرتھ نہیں رکھتے۔ جس روز تمہارے بھیا فرنٹ پر مارے گئے...... اُسی دن...... میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے سندھیا، یا شکنتلا یا پاروتی یا رجنی نہیں بننا ہے۔ یہ نام اُن لڑکیوں کے ہیں جو متھرا، پریاگ، وارانسی اور اجودھیا کے مندروں میں ایسی ہی

کیرتن منڈلیوں کے ساتھ بیٹھی منجیرہ بجا رہی ہوں گی...... یا بے جان مورتیوں کو پنکھا جھل رہی ہوں گی...... یا...... یا پھر......

راج : تم رُک کیوں گئیں......؟ آگے کیا کہنا چاہتی تھیں تم؟

شانتی : یا پھر...... کسی ریڈ لائٹ ایریا میں...... جاگ رہی ہوں گی رات گئے...... بدبودار پسینے میں نہائے ہوئے کسی اجنبی کے ساتھ...... فائیو اسٹارز تک تو پہنچنے سے رہیں۔ (ہنستی ہے)

[وقفہ...... ہوا کا شور...... اسی کے ساتھ حزینہ موسیقی کی ایک لہر، دھیرے دھیرے ڈوبتی ہوئی۔]

[بھاری قدموں کی گونج]

رائے صاحب : (نرم لہجے میں) شانتی...... بیٹی شانتی لتا!

شانتی : جی...... بابو جی!

رائے صاحب : تم کب سے اِسی طرح بیٹھی ہوئی ہو؟ کب تک یوں ہی بیٹھی رہوں گی؟

[شانتی کی سسکیاں]

رائے صاحب : ارے پگلی...... تم تو رونے لگیں...... رونا تو مجھے بھی چاہیے تمہارے ساتھ۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اکیلی ہوگئی ہو سبھاش کے دیہانت کے بعد...... کیوں؟ مگر میں...... میں بھی تو ادھورا ہوگیا ہوں بیٹی...... وہ میرا بڑا بیٹا تھا نا...... (آواز بھرا جاتی ہے)

[پاس آتے ہوئے قدموں کی چاپ]

راج : بابو جی...... بابو جی!

رائے صاحب : (چونک کر) کون؟ راج...... کیا ہے بیٹے؟

راج : آپ رو رہے ہیں بابو جی؟

رائے صاحب : نن...... نہیں تو...... میں رو تو نہیں رہا ہوں...... (مصنوعی ہنسی) دیکھو

راج، ایسا کرو، تم شانتی کو ذرا محنت سے پڑھاؤ۔ وہ پڑھنا چاہتی تھی نا......
اور سبھاش بھی تو یہی چاہتا تھا...... (وقفہ) سبھاش بھی یہی چاہتا تھا نا۔

راج : (دھیرے سے) ہاں......

[ہوا کا شور]

[فیڈ آؤٹ]

شانتی : (پڑھتے ہوئے) We do not know much of the future..... except that from generation to generation..... the same things happen again and again..... men learn little from other's experience..... but in the life of one man, never the same time returns.....

[کتاب بند کر دیتی ہے۔ آواز کے ساتھ، ماچس جلانے کی آواز]

شانتی : (اپنے آپ سے) بکواس...... سب بکواس ہے۔

گیتا : (جمائی لے کر) او شانتی...... شانتی...... اب لائٹ آف کرو اور سو جاؤ...... تمہیں پتا ہے، رات کے کتنے بجے ہیں؟

شانتی : رات سونے سے چھوٹی تو نہیں ہو جاتی گیتا...... کیوں؟

گیتا : ہو جاتی ہے میری جان! ہو جاتی ہے چھوٹی۔ آزما کر دیکھ لو...... اور یہ کیا...... تم نے پھر سگریٹ سلگا لیا...... گندی بات! چھوڑو یہ لت...... نہیں تو لوگ کہیں گے کہ رائے صاحب کی بہو ولایت جا کر ایک دم میم بن گئی...... (چمکارتے ہوئے) سو جاؤ اب۔ آؤ، آؤ۔ مجھ سے لپٹ کر سو جاؤ۔ (دھیرے سے) آؤ۔

[سوئچ آف کرنے کی آواز............ حزینہ موسیقی کی ایک لہر]

شانتی : میں نے کہا نا کہ میں سندھیا یا شکنتلا یا پاروتی یا رجنی نہیں بننا چاہتی تھی۔ مجھے بھجن کیرتن سے زیادہ دلچسپی ایلیٹ اور سارتر اور کامیو سے تھی...... میں

بھول جانا چاہتی تھی...... سب کچھ...... بھول جانا چاہتی تھی۔

راج : بھیا کو بھی؟

شانتی : ہاں! موت ہم سے جس کسی کو چھینتی ہے، اُسے مٹا بھی دیتی ہے۔ اسے یاد کرنا اپنے آپ کو کشٹ دینا ہے...... اور اُنہیں بھی کشٹ دینا ہے جو ہمیں سکھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں میرا اپنا سوارتھ بھی رہا ہوگا...... پر...... سچ مانو راج، مجھے اپنے آپ سے زیادہ بابوجی کی چنتا تھی...... جس روز میں انگلینڈ سے واپس آئی اور بابوجی نے مجھے دیکھا، تو اُن کے چہرے پر گہرا اطمینان تھا۔

[سڑک کا شور، ٹریفک، موٹر کا ہارن.......... اچانک بریک لگتے ہیں۔]

رائے صاحب : راج! بیٹے...... ذرا دیکھ بھال کر موٹر چلاؤ۔

راج : سوری بابوجی!

رائے صاحب : (ہنس کر) مجھے اپنا نہیں، شانتی کا خیال ہے۔ ابھی ابھی تو وہ ولایت سے لوٹی ہے۔ کہے گی کہ ہم گنوار Native لوگوں کو گاڑی چلانی بھی نہیں آتی......

[گاڑی رُکتی ہے۔ سب گاڑی سے اُترتے ہیں۔ دروازے بند ہونے کی آواز۔]

سانیال صاحب : اوہ...... رائے صاحب! بہو کو لے کر آگئے ایئرپورٹ سے!

رائے صاحب : تم؟ سانیال؟ لیکن جا کہاں رہے ہو؟ چلو، اندر چلو۔

سانیال صاحب : چلتا ہوں...... میں تو یہ سوچ کر واپس جا رہا تھا کہ تم پتا نہیں کب واپس آؤ۔

[ملے جلے قدموں کی چاپ...... وقفہ...... سب بیٹھ جاتے ہیں]

سانیال صاحب : کیسا رہا تمہارا سفر؟

شانتی : بہت اچھا...... اور ایکسائٹنگ!

رائے صاحب : شانتی......اوہ......اب تو ڈاکٹر شانتی لتا کہنا چاہیے......(ہنستے ہیں)

شانتی : جی بابو جی!

رائے صاحب : ایسا ہے کہ تم جا کر تھوڑا آرام کر لو......راج......سامان رکھوا دیا سب ٹھیک ہے؟

راج : ہاں!

رائے صاحب : تو جاؤ......شانتی کو لے جاؤ۔ اُس کمرے میں جو تمہاری سورگیہ ماں کا کمرہ تھا۔ شانتی اُسی کمرے میں رہے گی۔

[جاتے ہوئے قدموں کی چاپ]

سانیال صاحب : تم کسی سوچ میں ڈوب گئے رائے صاحب۔

رائے صاحب : نہیں سانیال! (ایک گہرا سانس لیتے ہیں) سوچ کر بھلا کیا ملتا ہے......سبھاش گیا۔ پھر اس کی ماں! ونودنی اپنی سسرال میں مگن ہے۔ راج نے سارا بزنس سنبھال لیا ہے۔ مجھے اب کوئی چنتا نہیں۔ شانتی بھی خوش دِکھائی دیتی ہے۔ کیوں؟ اب مجھے کوئی چنتا نہیں!

سانیال صاحب : ہاں! ایسا ہی لگتا ہے۔ تمہارا فیصلہ ٹھیک تھا۔

رائے صاحب : ہاں...... (رُک کر) ٹھیک ہی تھا۔ اصل میں شانتی کا گریجویشن ہوتے ہی یہ اُلجھن سامنے آ گئی تھی کہ اب کیا ہو؟ وہ سبھاش کو پہلے سے زیادہ یاد کرنے لگی تھی۔ اسی لیے تو میں نے...... یہ طے کیا کہ اپنا ایم۔اے پورا کرنے کے بعد وہ دو چار برس کے لیے باہر چلی جائے......

[موسیقی کی لہر]

راج : (قریب آتے ہوئے) ہلو بھابی!

شانتی : ہلو راج!

راج : یہ کتاب بند کرو......اور......اور مجھ سے باتیں کرو۔

شانتی : (مضمحل ہنسی کے ساتھ) تم میرے چپ رہنے سے ڈرتے ہو شاید۔

راج : ہاں، ڈرتا ہوں۔

شانتی : کائر کہیں کے...... (ہنستی ہے)

[وقفہ]

راج : تمہیں West پسند آیا؟

شانتی : ہاں (ماچس جلا کر سگریٹ سلگاتی ہے)

راج : یہ لت تم نے کیوں لگالی؟

شانتی : یہ بھی ایک سادھن ہے جینے کا۔ اِسے لت کہنا ٹھیک نہیں۔ جس طرح ہم شاپنگ کرتے ہیں اور پارٹیوں میں جاتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں...... اور ریڈیو سنتے ہیں اور فلمیں دیکھتے ہیں۔

راج : یہ سب اپنے شونیہ کو، من کے خالی پن کو، سونے پن کو بھرنے کا ایک بہانہ ہے!

شانتی : Academic باتیں کروگے تو مجھے ہنسی آجائے گی۔

راج : تو کیا میں غلط کہہ رہا تھا......

شانتی : ہاں! تم بکواس کر رہے تھے۔ Rubbish، ایسی باتوں کا کوئی بھاؤ نہیں ہوتا۔

راج : تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو بھابی۔

شانتی : دھوکا دینا، سندھیا یا شکنتلا یا پاروتی بننا ہے۔ بھجن کیرتن، گیتا پاٹھ، مندر، دیوداسیاں، Brothels، میں ان سب سے بچنا چاہتی تھی۔ میں اپنے آپ کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

راج : پھر...... بھلا چاہتی کیا تھیں؟

شانتی : (ہنستی ہے) بتاؤں؟ (پھر ہنستی ہے)

راج : (پُرخیال انداز میں) ہوں...... بتاؤ۔

شانتی : (سنجیدگی کے ساتھ) میں ماں بننا چاہتی تھی...... مگر...... تمہارے

بھیا...... (رُک کر) یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ......اور راج! سچ پوچھو تو اس کامنا میں بھی ایک سوارتھ چھپا ہوا تھا...... ماں بننا...... یہی ایک اکیلا سادھن ہے عورت کے لیے اپنی پہچان کا اور اپنے ادھورے پن کے احساس سے بچنے کا...... ماں پوری عورت ہوتی ہے۔ سمجھے۔

راج : (پُرخیال انداز میں) ہوں......!

شانتی : (اُداسی سے) اس حویلی میں سب کچھ ہے۔ میرے پاس سب کچھ ہے...... تم نے بزنس سنبھال رکھا ہے۔ میں کالج میں پڑھاتی ہوں۔ میں نے دُنیا دیکھی ہے۔ دھن دولت، نوکر چاکر...... مجھے کسی کی محتاجی نہیں۔ تمہاری بھی نہیں۔ بابوجی...... سب کچھ...... اس طرح جما گئے تھے کہ ان کے بعد بھی کہیں بکھراؤ یا ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی۔ سارے سکھ ہیں میرے پاس۔

راج : تم یہ نہیں سوچتیں بھابی کہ تمہیں اس سارے سکھ کا کتنا بڑا مول چکانا پڑا ہے...... چکانا پڑ رہا ہے۔

شانتی : (ہنستے ہوئے) پھر وہی Intellectual باتیں۔

راج : (خفا ہو کر) وہ گھنے جنگل...... جن کے دامن میں چھپی ہوئی بستی کی دُھول تمہارا بچپن ہے...... ندی کا وہ کنارا...... جہاں تم سندھیا اور پاروتی اور رجنی اور شکنتلا کے ساتھ گھومتی پھرتی تھیں...... ہوا کی ایک آزاد، منچلی اور شکتی وان لہر کی طرح......تم بھول گئیں وہ سب!

شانتی : (تیز لہجے میں) ہاں!

راج : تمہیں یاد نہیں آتا اپنا وہ **نشچھل** اور نربھئے روپ؟

شانتی : (ہانپتے ہوئے) نہیں!

راج : تم یہ نہیں سوچتیں کہ تم نے اپنے چاروں اُور دیواریں چن رکھی ہیں؟

شانتی : (ہانپتے ہوئے) نہیں!

راج : اور تم آپ اپنے وِچاروں کی بندی بن کر رہ گئی ہو؟

شانتی : (روہانسی ہو کر) نہیں...... نہیں...... نہیں......

راج : ٹھیک ہے! ایک بار آدمی اپنی آتما کا سودا کر لے تو پھر...... وہ سدا کے لیے چنتا مکت ہو جاتا ہے...... تمہارے سُونے پن کی لپٹیں مجھ تک پہنچتی ہیں...... مگر تم...... تم اسے سویکار نہیں کرنا چاہتیں۔

شانتی : (چیخ کر) راج..........!

[پس منظر سے لرزہ خیز موسیقی کی ایک لہر]

[فیڈ آوٗٹ]

[وقفہ]

[فیڈ اِن]

[شام کا تاثر، دُور مندروں کے گجر بجتے ہوئے۔ ہوا کا دھیما شور۔ اس شور کے ساتھ کبھی مندر میں کیرتن منڈلی کے گاین کی کوئی لہر اُبھرتی ہے...... اسی پس منظر میں شانتی کی آواز سنائی دیتی ہے، خود کلامی کے انداز میں پڑھتے ہوئے]

شانتی : یہ دھوپ کنارا...... شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت یہاں
جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دُھواں
اِس دھوپ کنارے پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
بانہوں کی چھنک

یہ میل ہمارا جھوٹ نہ سچ
کیوں راز کرو، کیوں دوش دھرو
کس کارن جھوٹی بات کرو...... (فیضؔ)

گیتا : (تالیاں بجاتے ہوئے) واہ...... واہ...... وا وا...... (چونک کر) ارے! تم رُک کیوں گئیں؟

شانتی : اِتنا بہت ہے...... گیتا...... Enough for today۔

گیتا : یہ تم اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھیں کہ کچھ پڑھ رہی تھیں؟

شانتی : فیضؔ کی ایک کویتا...... اِسے پڑھ رہی تھی اور اِس کے مادھیم سے......

گیتا : اوہ شانتی......تم پھر چپ ہو گئیں۔

شانتی : اِس کے مادھیم سے شاید باتیں بھی کر رہی تھی اپنے آپ سے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے......

گیتا : کیا ہوتا ہے؟

شانتی : کہ ہم دوسروں کے لکھے میں اپنے آپ کو پڑھتے ہیں۔

گیتا : زیادہ Philosophical مت بنو! چلو...... باہر چلتے ہیں۔

شانتی : باہر؟

گیتا : ہاں! آندھی کا زور ٹوٹ چکا...... آسمان صاف ہے...... اور شام ہونے والی ہے۔ مندر میں پروہت پریکرما کر رہے ہوں گے۔ چلو، باہر چلیں۔

شانتی : نہیں! میں ابھی ابھی تو لوٹ کر آئی ہوں باہر سے......

گیتا : (ہنس کر) Truly Philosophical تم تو یہیں بیٹھی ہو دوپہر کے بعد سے۔

شانتی : ایک جاترا بیٹھے بیٹھے بھی کی جاتی ہے۔

گیتا : اور...... (منہ بنا کر) Metaphysics ۔

شانتی : آتما نراکار نہیں ہوتی...... فزکس اور میٹا فزکس میں اُتنی دُوری نہیں جتنی

کہ دِکھائی دیتی ہے۔

گیتا : اوہ...... Wonderful...... (مذاق کے انداز میں) تو تم باہر کہاں کہاں ہو آئیں؟

شانتی : لمبی کہانی...... پھر سنائیں گے!

گیتا : کیوں؟ ابھی کیوں نہیں؟

شانتی : میں نے بچپن میں ایک گیت سنا تھا...... گاؤں کی سہاگنوں کو گاتے ہوئے۔

گیتا : (پُرخیال انداز میں) ہوں۔

شانتی : مجھے اس گیت کے بول یاد نہیں ...... بہت کچھ بھول چکی ہوں۔ اُن دنوں کی اُور مڑ کر دیکھتی ہوں تو بیچ میں...... اتنا گہرا...... دُھند کی ایک دیوار سی آجاتی ہے۔

گیتا : تمہیں اِس گیت کا خیال کیسے آیا؟

شانتی : ہر خیال کسی نہ کسی دوسرے خیال سے جڑا ہوتا ہے۔ یہ تو ایک سلسلہ ہے۔ ضروری نہیں کہ اس سلسلے کی سب کڑیاں ملتی جائیں...... کہیں کہیں...... یہ سلسلہ پکڑ میں نہیں آتا۔

گیتا : وہ گیت......؟

شانتی : ہاں! اس کے بول یاد نہیں آرہے ہیں اس سمئے...... مگر بھاؤ یاد ہے۔

گیتا : کیا......؟

شانتی : یہ برہن کا گیت ہے...... جو انگنائی میں لگے ہار سنگھار کی اُور دیکھتی ہے۔ پھر کہتی ہے...... ڈالیاں پھولوں سے بھر گئیں...... مگر میں سونی ہوں...... میرے بدن پر پھول کھل اُٹھے...... مگر میں سونی ہوں...... میری آتما میں پرندوں کے چہچہے گونج رہے ہیں...... مگر میں سونی ہوں۔

گیتا : (بھرائی ہوئی آواز میں) اور؟ اور؟ اور؟

شانتی : اس سونے پن کو بھرنے کے لیے...... میں کب سے بے چین ہوں۔ تم آتے کیوں نہیں...... آؤ...... ڈالیاں پھولوں سے بھر گئیں...... میرے بدن کی ٹہنی تمھیں پکار رہی ہے...... آؤ! اِن پھولوں کو چن لو...... میری آتما میں چہچہاتے پرندوں کی پکار سنو! اِن کے کنٹھ پیاسے ہیں۔ بہتے پانی کی اٹوٹ دھارا نہ سہی...... تم اوس کی کچھ بوندیں ہی لے کر آجاؤ...... آجاؤ۔

گیتا : (اپنے آپ سے) آجاؤ...... آجاؤ......

شانتی : تم بہت پیاسی ہو گیتا! تمہاری آتما......

گیتا : آتما کیا شریر سے الگ ہے شانتی؟

شانتی : ایسی باتیں کہی نہیں جاتیں، پوچھی بھی نہیں جاتیں۔

گیتا : پھر؟

شانتی : بس سمجھ لی جاتی ہیں۔

گیتا : (پُرخیال انداز میں) ہوں۔

[پس منظر سے موسیقی کی ایک نرم، دھیمی لہر۔]

شانتی : ایک روز راج سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ ایسی ہی ایک شام تھی۔ اُس روز بڑے زوروں کی آندھی آئی تھی۔ گل مہر کی ٹہنیاں ٹوٹ رہی تھیں اور پھول سارے لان میں بکھر گئے تھے۔

[ہوا کا شور...... جھکڑ...... طوفان...... Flash Back]

راج : (دُور سے) بھابی! بھابی......!

شانتی : کیا ہے راج؟ (ہانپتے ہوئے) کیا ہے؟

[قدموں کی چاپ]

راج : ارے...... تم تو ہانپ رہی ہو۔ دیکھو...... باہر کتنا بھینکر طوفان ہے۔

شانتی : ہاں!

راج : اور اندر بھی......

شانتی : یہ تم کیا کہہ رہے ہو...... اوہ! میں سمجھی...... یہ دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر ہل رہا ہے۔ ایسا کرو کہ وہ سامنے والی کھڑکی بند کر دو! پلیز!

راج : طوفان تمہارے کمرے میں نہیں......

شانتی : پہیلیاں مت بجھاؤ راج!

راج : طوفان تمہارے اندر ہے......

شانتی : (سختی سے) بکومت!

راج : دیکھو بھابی...... میں جو کہہ رہا ہوں، اُسے سمجھنے کی کوشش کرو۔

شانتی : تم کیا کہنا چاہتے ہو...... (سختی سے) کہو!

راج : پانی میں اُبال آجائے تو دیگچی کا ڈھکنا تھوڑا اُٹھا دینا چاہیے...... نہیں تو......

شانتی : نہیں تو کیا؟

راج : نہیں تو...... نہیں تو سب کچھ بھک سے اُڑ جائے گا۔

[دُور سے آتی ہوئی ایک لمبی چیخ...... ہوا کا شور...... لرزہ خیز موسیقی]

[فیڈ آؤٹ]

شانتی : میں نے اُسی شام گھر چھوڑ دیا۔ میں ورکنگ وِیمن ہاسٹل میں چلی گئی۔ وہاں بڑی مشکل سے میں نے دس دن کاٹے...... وہاں مجھے ایسا لگا کہ ایک ساتھ بہت سی دیگچیاں...... چولہے پر چڑھی ہوئی ہیں اور اندر سارے کا سارا پانی بھاپ بن چکا ہے۔ میں نے اس ساری گھٹن سے تنگ آ کر، گھبرا کر...... ہاسٹل بھی چھوڑ دیا۔

گیتا : اور اب...... تم پھر اُن ہی دنوں کو یاد کر رہی ہو! کیوں؟

شانتی : ہاں...... مگر بھلانے کے لیے۔ کسی کو بھلانے کے لیے...... کوئی ویکتی ہو، یا وستو، یا سمئے کا کوئی پل...... بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ یاد کرنا پڑتا ہے...... بھلانے سے پہلے......

گیتا : بھول جاؤ! بھول جاؤ شانتی اور دُکھ مت اُٹھاؤ۔

شانتی : (کچھ سوچتے ہوئے) ہوں! مجھے یادوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ Actually I hate them، یہ سب بھولنے ہی کے تو سادھن ہیں...... میں نے سارے بزنس کا بٹوارہ کرلیا۔ اپنا Share الگ کر کے میں نے بیچ دیا...... راج ہی کے ہاتھوں...... پھر میں نے یہ کوٹھی خرید لی۔ یہ جگہ پہلے بہت اچھی تھی۔ آس پاس سناٹا تھا...... سامنے بہتا ہوا دریا۔

[پس منظر سے مندر کی گھنٹیاں]

شانتی : یہ مندر تو ابھی حال میں بنا ہے۔ دو برس پہلے...... ایک شام میں ٹہلتی ہوئی اُدھر جا نکلی۔ کیرتن ہو رہا تھا اور اُجاڑ چہرے، سونی آنکھوں، مٹ میلے بالوں والی ایک ادھیڑ عمر کی عورت منجیرہ بجا رہی تھی...... میں اسے دیکھتے ہی پہچان گئی۔

گیتا : کون تھی وہ؟

شانتی : سندھیا...... (سپاٹ لہجے میں) مگر ہم دونوں نے ایک دُوسرے کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ میں نہ تو سندھیا بننا چاہتی ہوں...... نہ پاروتی...... نہ رجنی...... نہ شکنتلا!!

گیتا : تم چاہتی کیا ہو؟

شانتی : کچھ نہیں...... سوائے اس کے کہ اپنا آپ سنبھالے رکھوں۔ وہی بنی رہوں جو کچھ کہ ہوں...... شانتی!!

گیتا : تو تم سمجھتی ہو کہ اپنے آپ میں سمپورن ہو؟

شانتی : (ہانپتے ہوئے، بھرائی ہوئی آواز میں) نہیں!

گیتا : تم اپنے آپ میں شانت ہو؟

شانتی : (اُسی لہجے میں) نہیں!

گیتا : دُوسرے کا سہارا چاہتی ہو؟

شانتی : (چیخ کر) نہیں...... نہیں...... نہیں...... میں صرف ماں بننا چاہتی تھی......بس......اور کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں۔

[سسکیاں...... ہیجان خیز موسیقی کی ایک لہر]

[فیڈ آؤٹ]

OO

کھڑکی

کھڑکی

پہلا منظر :

[کیمرہ شہر کے مختلف علاقوں، بازاروں، دفتروں، بھری پُری سڑکوں، آتی جاتی ریل گاڑیوں کا ایک مونتاج بناتا ہوا...... اچانک ایک سنسان کالونی کی ایک گلی پر رُک جاتا ہے۔ گلی کا لانگ شاٹ، پھر ایک بند کھڑکی دِکھائی دیتی ہے۔ کیمرہ پین کرتا ہوا اس کھڑکی پر ٹھہر جاتا ہے۔ کھڑکی کے شیشوں سے روشنی جھانک رہی ہے۔ باہر اندھیرا ہے۔ کھڑکی کا کلوز اَپ۔ کھڑکی کے شیشوں کے پیچھے انجلی کی پرچھائیں۔]

[کٹ]

(۲)

انجلی کے کمرے کا اندرونی منظر :

[دیوار کے ساتھ ایک ایزل۔ پینٹنگ کا سامان، نئی پرائی تصویریں، کچھ ادھوری، ایک طرف چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل، میز پر ایک لیمپ جس کا شیڈ جھکا ہوا ہے۔ اس کی سمٹی ہوئی روشنی میں انجلی کا چہرہ، سوچ میں گم دِکھائی دیتا ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھی کچھ لکھ رہی ہے۔ اچانک رُک کر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتی ہے۔ گھڑی میں رات کا ایک بجتا ہے۔ دُور سے آتی

ہوئی کتوں کے بھونکنے کی صدا۔ کبھی کسی گاڑی کا ہارن چیختا ہے۔ پھر سناٹا اور گہرا ہو جاتا ہے۔ بس گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دیتی ہے۔ انجلی سامنے ڈائری رکھے، دانتوں میں قلم دبائے کچھ سوچ رہی ہے۔

اس پورے منظر سے جیسے جیسے پردہ ہٹتا جاتا ہے، ایک اجنبی، مردانہ آواز، بھاری اور گونجیلی سنائی دیتی ہے...... بیک گراؤنڈ سے......]

[سناٹا...... ہوا کا شور...... گھڑی کی ٹک ٹک]

آواز : میں ہوں رات کا ایک بجا ہے

خالی رستہ بول رہا ہے

کیسی اندھیری رات ہے دیکھو

اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے

ایسا گاہک کون ہے جس نے

سکھ دے کر دُکھ مول لیا ہے

کھڑکی کھول کے دیکھ تو باہر

دیر سے کوئی شخص کھڑا ہے

(ناصر کاظمی)

[فیڈ آوٹ]

[انجلی ایک بار پھر گھڑی کی طرف دیکھتی ہے۔ اپنی جگہ سے اُٹھتی ہے اور ایک سائیڈ ریک پر رکھا ہوا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیتی ہے...... غلام علی کی آواز میں ناصر کاظمی کی غزل کا کیسٹ............] (فیڈ اِن)

غزل : دل میں اک لہر سی اُٹھی ہے ابھی

کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

شور برپا ہے خانۂ دل میں

کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
بھری دُنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

[فیڈ آؤٹ]

[انجلی اب ایزل کی طرف دیکھتی ہے۔ ادھوری تصویر، پھر فرش پر بچھے قالین سے بکھری کتابیں سمیٹ کر ایک طرف رکھتی ہے اور لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ انجلی کا کلوز اَپ...... کیمرہ اب دیوار کی طرف اُٹھتا ہے، جہاں گھڑی لگی ہوئی ہے۔ گھڑی کا زُوم اِن شاٹ۔ جب تک کیسٹ پر غزل چلتی رہتی ہے، انجلی آنکھیں بند کیے پڑی رہتی ہے۔ غزل ختم ہوتے ہی اُٹھ کر لیمپ بجھاتی ہے۔ پھر لیٹ جاتی ہے۔ باہر سے چھن کر آتی ہوئی دھیمی روشنی میں سارا کمرہ پرچھائیوں میں گھرا سا لگتا ہے۔]

[کٹ]

دُوسرا منظر :

[دیال صاحب کی اسٹڈی...... چاروں طرف کتابیں۔ ایک طرف رائٹنگ ٹیبل، ایک ایزی چیئر، دیال صاحب کرسی میں ڈوبے ہوئے پڑھ رہے ہیں۔ دروازے پر دستک، بہت دھیمی۔ دیال صاحب اُٹھ کر دروازہ کھولتے ہیں۔]

دیال صاحب : اوہ...... آرتی...... یہ تم ہو!

آرتی : (اندر آتی ہیں) آپ کو پتا ہے کب سے اس کمرے میں بند ہیں۔

دیال صاحب : (دھیرے سے) Since Eternity!

آرتی : (حیرت سے) کیا؟

دیال صاحب : (بیٹھتے ہوئے) کمرہ......کون سا کمرہ؟

[آرتی حیرانی سے اُن کی طرف دیکھتی ہیں، پھر چائے بنانے لگتی ہیں۔]

دیال صاحب : دیکھو آرتی! بات یہ ہے کہ ہم سب، چاہے گھر سے باہر ہوں، چاہے گھر میں......ایک کمرے میں بند رہتے ہیں۔

آرتی : (چائے کی پیالی بڑھاتی ہیں) پہیلیاں بجھا رہے ہیں آپ!

دیال صاحب : (مسکرا کر) یہی تو اصل اُلجھن ہے میری۔ سیدھی سادی باتیں بھی لوگوں کو پہیلیاں جان پڑتی ہیں۔ ویسے سچ پوچھو تو ہر بات ایک پہیلی ہے۔ ہر انسان ایک بھید......اوہ۔ خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ، انجلی کہاں ہے؟

آرتی : ابھی کالج سے نہیں لوٹی۔

دیال صاحب : ارے...... پانچ بج گئے۔ اب تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔ کچھ کہہ گئی تھی جاتے سمے؟

آرتی : نہیں......(ہونٹ بھینچ کر) وہ کبھی کچھ کہتی کب ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا......

دیال صاحب : تو کیا کچھ سمجھنے کے لیے، سمجھانے کے لیے، کچھ کہنا یا بولنا ضروری ہے؟ ہم شبدوں پر اِتنا بھروسہ کیوں کرنے لگے ہیں؟

آرتی : (اچانک گھبرا کر) شبد...... شبد...... یہ تم کہہ رہے ہو؟ تم...... جو صبح سے شام تک، شام سے صبح تک بس شبدوں میں گھرے رہتے ہو۔ کتابوں میں......اور شاید اپنے خوابوں میں......

دیال صاحب : خواب؟ سپنا؟ سپنے دیکھنا تو کب کا چھوٹ گیا۔ ویسے سوپن بھی سچائی ہی کا ایک روپ ہے۔ جو جسے دِکھائی دے، اس کے لیے وہی سچ ہے...... چلو چلیں...... باہر چلتے ہیں۔

آرتی : (رُک کر) باہر سے تمہارا مطلب ہے......؟

دیال صاحب : ہاں......بھیتر......وہی جو تم سمجھ رہی ہو......آنگن میں۔

(آرتی کا کھنکتا ہوا قہقہہ)

دیال صاحب : (حیرانی سے) یہ...... یہ کیا؟

(آرتی پھر ہنستی ہے)

دیال صاحب : (سخت لہجے میں) آرتی! آرتی! تم میری ہنسی اُڑا رہی ہو؟

(آرتی کی ہنسی...... لگاتار ہنسی۔ دیال صاحب کے چہرے پر اُلجھن اور ناگواری کے آثار)

آرتی : (لگاتار ہنستے ہوئے) باہر کا بھیتر...... بب (ہنستی ہیں) باہر...... باہر......بھیتر...... باہر کا بھیتر۔

(آرتی پر ہنسی کا دورہ سا پڑتا ہے۔ دیال صاحب کے چہرے پر گہری اُداسی، غصے اور بے چینی کا ملا جلا رنگ۔

[فیڈ آوٹ]

تیسرا منظر :

[دوپہر کا وقت...... کالج۔ آرٹس انسٹی ٹیوٹ کی عمارت، چند لڑکے لڑکیاں ایک دائرہ بنائے لان میں بیٹھے ہیں اور باتیں کر رہے ہیں۔ کچھ لڑکے اور لڑکیاں اِدھر اُدھر پتھر کی کسی بنچ پر، یا سیڑھی پر...... یا کسی پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے...... اسکیچنگ کر رہی ہیں۔ اچانک انجلی دِکھائی دیتی ہے۔ اسکیچ بک گھٹنوں پر رکھے، خاموش بیٹھی ہوئی آسمان کی طرف دیکھ رہی ہے۔]

شوبھا : (دُور سے) انجلی......انجلی......!

[انجلی ایک بار مڑ کر شوبھا کی طرف دیکھتی ہے، پھر اپنے آپ میں گم ہو

جاتی ہے۔]

نیلم : (شوبھا کی طرف بڑھتے ہوئے) ہائے شوبھا! کیسے پکار رہی ہو؟ اوہ! انجلی!

انجلی : (ایک بار پھر مڑ کر دیکھتی ہے) کیا بات ہے؟

[دونوں شرارت آمیز انداز میں مسکراتی ہوئی انجلی کی طرف جاتی ہیں۔]

نیلم : (حیرت سے) ارے...... یہ کیا؟

[انجلی سوالیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھتی ہے]

شوبھا : کیوں؟ کیا ہوا؟

نیلم : (انجلی کی اسکیچ بک کی طرف اشارہ کرکے) ذرا یہ دیکھو...... (اسکیچ بک اُٹھانا چاہتی ہے)

انجلی : (خفا ہوکر) چھوڑ دو اِسے...... چھوڑ دو!

[نیلم کا قہقہہ]

شوبھا : کیا ہے نیلم؟

نیلم : سامنے ہرا بھرا پیڑ ہے مگر اس اسکیچ میں...... ساری ٹہنیاں سوکھی ہوئی۔ کسی ڈال پر ایک پتہ بھی نہیں۔ یہ نیچر اسٹڈی ہے کہ مذاق؟

[انجلی اُداسی سے اُس کی طرف دیکھتی ہے]

شوبھا : بھلا تمہیں ہوا کیا ہے انجلی! یہ سب کیا بکواس ہے؟ تم کب سے یہاں اکیلی بیٹھی ہوئی ہو؟ چلو...... اُٹھو۔

نیلم : لیکن...... پہلے یہ بتاؤ کہ یہ قصہ کیا ہے؟

[اسکیچ بک کی طرف اشارہ کرتی ہے۔]

انجلی : (دھیرے سے) وہی پُرانا قصہ!

شوبھا : کیا؟

انجلی : کوئی بھی چہرہ ہو، آدمی کا یا پیڑ کا...... جیسا کچھ دِکھائی دیتا ہے، ضروری

نہیں کہ ویسا ہی ہو۔ ہر چہرے میں ایک...... اور کبھی تو ایک ہی نہیں، انیک چہرے چھپے ہوتے ہیں۔ یعنی وہی بات...... جو تمہارے ڈیڈی کہتے ہیں۔

[انجلی خالی خالی نظروں سے نیلم کی طرف دیکھتی ہے]

نیلم : (ہنسی روکتے ہوئے) باہر کے بھیتر؟

[نیلم اور شوبھا کا قہقہہ]

[پس منظر سے بار بار "باہر کے بھیتر...... باہر کے بھیتر" کا Echo۔ انجلی بت بنی کھڑی رہتی ہے۔ اُس کے چہرے پر دیال صاحب کی اسٹڈی کا منظر Super impose ہوتا ہے......]

[ڈیزالو]

چوتھا منظر :

[صبح کا وقت۔ آرتی کچن میں کام کر رہی ہیں۔ کال بیل بجتی ہے۔ چونکتی ہیں، پھر باہر کا دروازہ کھولتی ہیں۔ ایک نوجوان...... اٹیچی لیے کھڑا ہے۔ آرتی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی ہیں......]

نوجوان : میں اجے ہوں۔ اور آپ میری مامی...... ہے نا؟ (ہنستا ہے)

[آرتی کوئی جواب نہیں دیتیں۔ اجے حیرانی سے اُن کی طرف دیکھتا ہے۔]

اجے : اندر تو آنے دیجیے مامی......

[بغیر اجازت لیے اندر آجاتا ہے۔ آرتی ایک طرف کھسک جاتی ہیں۔]

اجے : ماما جی کہاں ہیں؟

آرتی : کون ماما جی؟

اجے : یہ گھر دیال صاحب کا ہے۔ شنکر دیال جی...... جو کالج میں اِتہاس پڑھاتے ہیں۔

[آرتی ''ہاں'' کے انداز میں گردن ہلاتی ہیں]

اجے : (ہنس کر) ہماری مامی شاید بہت کم بولتی ہیں...... ماما جی اس سمئے نہیں ہیں شاید...... پاس پڑوس میں کہیں گئے ہوں گے۔

[آرتی کے چہرے پر وہی حیرانی]

اجے : کوئی بات نہیں...... میں ذرا منہ ہاتھ دھولوں۔ پھر چائے پیوں گا۔ پھر جم کر سوؤں گا۔ ریزرویشن تو مل گیا تھا، مگر مامی جی...... مجھے ریل گاڑی میں کبھی نیند نہیں آتی۔

[آرتی حیرت سے اُسے دیکھتی رہتی ہیں۔]

اجے : برتھ پر لیٹے لیٹے آدمی لگاتار ہلتا رہتا ہے۔ ایسے...... (ہلنے کی ایکٹنگ کرتا ہے، پھر آرتی کو غور سے دیکھتا ہے) ہے نا مامی! تو ماما جی جیسے ہی آئیں، مجھے جگا دیجیے گا۔

آرتی : (سنجیدگی سے) وہ اپنی اسٹڈی میں ہیں۔ کوئی پیپر لکھ رہے ہیں۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ کوئی اُنہیں ڈسٹرب نہ کرے۔ بارہ بجے تک کمرے سے نکلیں گے۔

اجے : (چمک کر) ارے واہ...... یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں اِتنی دُور سے چلا آرہا ہوں...... اُنہیں دیکھ تو لوں...... کدھر ہے اُن کی اسٹڈی......

[آرتی ایک طرف اشارہ کرتی ہیں۔ چہرے پر گھبراہٹ]

آرتی : (جھجکتے ہوئے) لل...... لیکن...... (وہیں کھڑی رہتی ہیں)

اجے : (آگے بڑھتا ہے) لیکن ویکن کچھ نہیں۔ (آگے بڑھتا ہے) ماما جی...... (پکارتے ہوئے) ماما جی...... (دروازے پر دستک)

[کیمرہ آرتی پر مرکوز رہتا ہے۔ اجے کا سوٹ کیس قریب ہی فرش پر رکھا

ہوا ہے۔]

[پاس سے آتی ہوئی آوازیں]

اجے : (گڑبڑا کر) اررارے رے یہ کیا...... آپ!

انجلی : میں انجلی ہوں۔ آپ کون ہیں؟

اجے : میں اجے ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتیں۔ میں آپ سب کو جانتا ہوں۔ لیکن میں تو سمجھا تھا کہ یہ ماما جی کی اسٹڈی ہے۔

انجلی : اُن کی اسٹڈی وہ سامنے ہے! (دروازہ بھڑ سے بند کرنے کی آواز)

[آرتی کے چہرے پر پریشانی]

[کٹ]

[اجے اب دیال صاحب کے کمرے پر دستک دیتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔ دیال صاحب کی اسٹڈی۔ اپنی اسٹڈی کے دروازے پر حیران سے کھڑے ہیں۔]

اجے : ماما جی...... یہ میں ہوں...... اجے۔

دیال صاحب : (اُسے گھور کر دیکھتے ہوئے) ہوں...... (سوچنے کے انداز میں) اجے...... اجے فرام کانپور؟

اجے : (ہنس کر اُچھل پڑتا ہے) ہاں ہاں فرام کانپور۔ میں بہت چھوٹا تھا جب آپ نے مجھے دیکھا تھا۔ ماں جی بتاتی تھیں کہ آپ راجن ماما کے ساتھ گھر آیا کرتے تھے۔ ایک روز میں نے آپ کی پینٹ پر سیاہی اُلٹ دی تھی...... یاد ہے...... یاد ہے؟

[دیال صاحب کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی۔ ان کا کلوز اَپ Defocussed، ہونٹ ہلتے ہوئے۔ دھیرے دھیرے کہتے ہیں۔]

دیال صاحب : یاد ہے...... یاد ہے۔

[اجے حیرت سے اُن کی طرف دیکھ رہا ہے۔]

[کٹ]

پانچواں منظر :

[دیال صاحب کی اسٹڈی۔ ایزی چیئر پر لیٹے ہوئے کچھ سوچ رہے ہیں۔ آرتی آتی ہیں۔]

آرتی : میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟

[دیال صاحب جواب دینے کے بجائے ویران آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھتے ہیں۔]

آرتی : میں نے موسموں کو بدلتے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر آپ کو نہیں۔ لیکن......

[دیال صاحب پھر اُسی انداز میں آرتی کی طرف دیکھتے ہیں۔]

آرتی : لیکن جب سے اجے یہاں آیا ہے، آپ بدل گئے ہیں۔ بہت بدل گئے ہیں۔

[دیال صاحب خاموش رہتے ہیں]

آرتی : اپنی اسٹڈی میں بیٹھے ہوئے، یا لیٹے ہوئے، آپ بس سوچتے رہتے ہیں...... اور یہ سوچ آپ کو ایک ہی راستے پر لے جاتی دِکھائی دیتی ہے۔

[دیال صاحب غور سے آرتی کی طرف دیکھتے ہیں۔]

آرتی : اُداسی کا راستہ۔ میں اس کا کارن جان سکتی ہوں؟

[دیال صاحب اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کرسی پر دونوں ہاتھ ٹیکے ہوئے......]

دیال صاحب : تم سچ سن سکوگی آرتی؟

[آرتی کے چہرے پر اُلجھن]

دیال صاحب : اور سچ سن کر بھی بدلوگی نہیں؟

آرتی : نہیں!

دیال صاحب : (گمبھیر لہجے میں) تو سنو!

[فلیش بیک]

پچیس برس پہلے...... اُن دنوں میں کانپور میں پڑھتا تھا...... ڈی۔اے۔وی۔ کالج میں...... میرا ایک دوست تھا...... راجن...... ہم دونوں ایک ساتھ رہتے تھے۔ راجن ہی کے گھر...... پریڈ ایریا میں اس کا گھر تھا۔ کلپنا راجن کی بہن تھی...... شاید ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے...... لیکن...... جب عمر بھر ساتھ نبھانے کی بات سامنے آئی تو کلپنا نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ اس نے ایک ڈاکٹر سے شادی کر لی...... میں ایک معمولی پترکار تھا...... میرا نہ تو کوئی ورتمان تھا، نہ بھوشیہ...... اور کلپنا سکیورٹی چاہتی تھی............ اجے کلپنا کا بیٹا ہے۔

[آرتی گہری آنکھوں سے دیال صاحب کی طرف دیکھتی ہیں۔]

دیال صاحب : مجھے کسی رشتے ناطے پر بھروسہ نہیں رہا آرتی۔ میں ہر طرف سے ٹوٹ کر اپنے آپ میں گم ہو گیا۔ میں کسان کا بیٹا تھا...... کاروباری جیون کے روپ بہروپ میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اب بھی سمجھ میں نہیں آتے۔

[آرتی کا کلوز اَپ]

دیال صاحب : میں سمجھنا بھی نہیں چاہتا شاید۔ کبھی کبھی جیون میں ایک ایسی استھتی جنم لیتی ہے کہ کچھ جانے، کچھ سمجھے بنا بھی ہم سب کچھ جان اور سمجھ

لیتے ہیں۔

[دیال صاحب کا کلوز اَپ]

دیال صاحب : میں نے زندگی کا جو راستہ اپنایا ہے، وہاں سارے رشتے ناطے اپنا ارتھ بدل چکے ہیں...... سماج، سنسار، سب کچھ...... میرے لیے اب بے معنی ہے......

[آرتی کا کلوز اَپ]

دیال صاحب : دُنیا سمٹ گئی ہے۔ دُوریاں بڑھ گئی ہیں۔ ہر سمبندھ کو ناپنے کا، ہمارے پاس ایک ہی پیمانہ رہ گیا ہے...... ہر انسان ایک کموڈیٹی ہے۔ ہر سمبندھ بیچا اور خریدا جا سکتا ہے۔

[آرتی کا کلوز اَپ]

دیال صاحب : اسی لیے تو میں اپنی چھوٹی سی دُنیا میں...... تمہاری اور انجلی کی دُنیا میں خوش ہوں...... اور نہیں چاہتا کہ ہماری اس دُنیا پر چاروں اور پھیلی ہوئی کاروباری دُنیا کی پرچھائیں پڑے۔

[اچانک سائڈ ریک پر رکھے کاغذ اُڑنے لگتے ہیں۔]

دیال صاحب : (چونک کر کاغذ سمیٹتے ہوئے) ارے...... یہ کھڑکی کس نے کھول دی...... بند کرو...... بند کر دو اُسے آرتی...... بند کر دو کھڑکی، نہیں تو میری ساری فائلیں بکھر جائیں گی۔

[آرتی کھڑکی بند کر دیتی ہیں۔ دونوں کاغذات سمیٹتے ہیں۔]

[کٹ]

چھٹا منظر :

[کسی پارک کا ایک ویران گوشہ۔ انجلی اور اجے ساتھ ٹہلتے ہوئے۔ سہمہ

پہر کا وقت۔]

اجے : (ایک بینچ کی طرف بڑھتے ہوئے) آؤ...... ذرا دیر بیٹھتے ہیں۔

[دونوں بیٹھ جاتے ہیں۔ اجے سگریٹ سلگاتا ہے۔]

اجے : (شرارت بھری نظروں سے انجلی کی طرف دیکھتا ہے) کم سے کم اتنا تو ہوا کہ تم آج گھر سے باہر نکلیں۔

انجلی : (کھوئے ہوئے انداز میں) ہوں۔

اجے : دیکھو! آسمان کتنا نیلا ہے...... اور چاروں طرف کتنی ہریالی ہے...... اور سمٹی ہوئی دھوپ میں بھی کتنی چمک ہے۔

انجلی : (اُسی انداز میں) ہوں۔

اجے : دیکھو...... بچے ہیں...... اور پھول...... اور ایک دوسرے سے پیار کرتے ہوئے، ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے...... لوگ......

انجلی : ہوں۔

اجے : (ہنس کر) ارے بابا...... اور بھی کچھ بولو۔

انجلی : کیا بولوں؟

اجے : کوئی بھی بات کرو...... کسی کی بھی۔

انجلی : کس کی؟

اجے : میں نے لگ بھگ ہر رات دیکھا ہے۔ جب ساری کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں، ایک کھڑکی کھلی دِکھائی دیتی ہے...... تمہارے گھر کے سامنے۔

انجلی : ہوں۔

اجے : کون ہے وہ؟

انجلی : بلراج!

اجے : کیا کرتا ہے وہ؟

انجلی : پترکار ہے۔

اجے : تم اُسے جانتی ہو؟

انجلی : بس اتنا ہی...... اور وہ بھی اس طرح کہ ایک بار اس کا کمرہ بند دیکھ کر ڈاکیہ اس کے نام کی رجسٹری ہمارے گھر دے گیا تھا......

اجے : اُس سے کبھی ملنا بھی ہوا؟

انجلی : ہاں، اُسی روز...... وہ اپنی رجسٹری لینے ہمارے گھر آیا تھا۔

اجے : اس سے کچھ بات بھی ہوئی؟

انجلی : نہیں۔

اجے : کیوں؟

انجلی : وہ باہر ہی سے چلا گیا تھا۔

اجے : تم نے اُسے روکا تھا؟

انجلی : نہیں۔

اجے : ماماجی اور مامی جی نے بھی نہیں روکا؟

انجلی : نہیں۔

اجے : اِس کا کارن؟

انجلی : ڈیڈی اور ممی کو اِس بات کی عادت نہیں۔

[اجے سوالیہ نظروں سے انجلی کی طرف دیکھتا ہے۔]

انجلی : وہ کبھی کسی سے ملنے نہیں جاتے...... کبھی کوئی اُن سے ملنے نہیں آتا۔

اجے : (غور سے انجلی کی طرف دیکھتا ہے) کیا یہ بات اُچت ہے؟

انجلی : پتہ نہیں...... یہ سوال من میں کبھی اُٹھا ہی نہیں۔

اجے : ایک بات پوچھوں انجلی؟

انجلی : پوچھو!

اجے : ماماجی اور مامی جی نے میرے یہاں آنے، پھر رہنے کا بُرا تو نہیں مانا؟

انجلی : شاید نہیں۔

اجے : اِس کا کارن بتا سکتی ہو؟

[انجلی جواب نہیں دیتی۔ دُور سڑک کی طرف دیکھنے لگتی ہے...... کیمرہ پین کرتا ہوا سڑک کے منظر کو سمیٹتا ہے...... دُکانیں، آتی جاتی موٹر کاریں، پھر ایک میڈیکل اسٹور کا بورڈ...... کیمرہ اسی بورڈ پر جا کر ٹھہر جاتا ہے۔]

اجے : تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا انجلی۔

انجلی : میرا خیال ہے کہ تم...... جو ایک ڈاکٹر ہو...... تمہیں ایسے بے کار سوالوں میں نہیں اُلجھنا چاہیے۔

اجے : (سنجیدہ لہجے میں اُداسی کے ساتھ) انجلی۔

انجلی : ہاں۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اجے۔ آدرش اسی لیے پالے جاتے ہیں کہ ایک روز ٹوٹ پھوٹ جائیں......

اجے : انجلی!

انجلی : جو اِس توڑ پھوڑ سے بچ جائے...... وہ آدرش تو نہیں۔

[اجے اچانک اُٹھتا ہے۔ انجلی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے]

اجے : چلو...... گھر لوٹ چلیں۔ مامی پریشان ہو رہی ہوں گی۔

[انجلی کا ایک لمبا قہقہہ...... اجے ڈری ڈری آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتا ہے۔ انجلی کی ہنسی اور تیز ہو جاتی ہے۔]

[کٹ]

ساتواں منظر :

[رات...... انجلی کی گلی کا لانگ شاٹ...... ہر طرف سناٹا اور اندھیرا...... کیمرہ انجلی کے کمرے کی کھڑکی پر ٹھہرتا ہے۔ شیشوں سے چھن کر آتی

ہوئی روشنی۔ اِس روشنی میں شیشوں کے پیچھے انجلی کی پرچھائیں سی......
پھر کیمرہ پین کرتا ہوا سامنے والے گھر کی کھڑکی پر ٹھہرتا ہے۔ یہ کھڑکی
کھلی ہوئی ہے۔ اندر سے دھیمے سروں میں آتی ہوئی ستار کی گت۔]

[کٹ]

[اچانک انجلی کے کمرے کی کھڑکی کھلتی ہے۔ انجلی کا جھانکتا ہوا چہرہ......
کھڑکی پھر بند ہو جاتی ہے۔]

[کٹ]

[سنسان گلی میں بلراج کی پرچھائیں...... بیک شاٹ۔ کیمرہ زُوم آوٹ
کرتا ہوا دُور تک گلی کے منظر کو سمیٹتا ہے۔ بلراج کی پرچھائیں دھیرے
دھیرے چھوٹی ہوتی جاتی ہے۔]

[ڈیزالو]

آٹھواں منظر :

[دیال صاحب کی اسٹڈی۔ دیال صاحب اور آرتی بیٹھے ہوئے چائے
پی رہے ہیں۔ سہ پہر کا وقت۔ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کا کلوز اَپ]

دیال صاحب : سمجھ میں نہیں آتا...... یہ اجے نے اچانک گھر کیوں چھوڑ دیا۔

آرتی : سمجھ میں نہیں آتا۔

دیال صاحب : انجلی سے تو کوئی بات نہیں ہو گئی تھی؟

آرتی : شاید نہیں......اور ہوئی ہو تو مجھے پتہ نہیں۔

دیال صاحب : تم نے انجلی سے پوچھا؟

آرتی : نہیں۔

دیال صاحب : کیوں؟

آرتی : انجلی خوش دِکھائی دیتی ہے۔

دیال صاحب : اجے کے جانے سے......

آرتی : پتہ نہیں!

[وقفہ]

دیال صاحب : (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) انجلی ابھی کالج سے نہیں لوٹی۔

آرتی : آجائے گی۔

دیال صاحب : تمہیں چنتا نہیں اِس بات کی؟

آرتی : نہیں۔

دیال صاحب : کیوں؟

آرتی : اِس لیے کہ انجلی ان دنوں نشچنت دِکھائی دیتی ہے۔

دیال صاحب : جب سے اجے گیا ہے۔

آرتی : ہاں......شاید۔

دیال صاحب : تم نے کلپنا کی چٹھی کا کیا جواب سوچا ہے؟

آرتی : میں نے اُنہیں جواب دے دیا ہے۔

دیال صاحب : (گھبراہٹ میں اُچھل پڑتے ہیں) کیا؟

آرتی : میں نے اُنہیں چٹھی بھیج دی ہے۔

دیال صاحب : (سنبھلتے ہوئے) کیا لکھا ہے تم نے کلپنا کو؟

آرتی : یہی کہ ہر ویکتی کا ادھیکار دُوسرے ویکتی پر سیمت ہوتا ہے۔

دیال صاحب : کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے؟

آرتی : یہی کہ انجلی پر ہمارا ادھیکار بھی سیمت ہے۔

دیال صاحب : اور؟ اور کیا لکھا ہے تم نے؟

آرتی : یہی کہ اپنے جیون کا فیصلہ انجلی خود کرے گی۔ ہم اُس پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتے۔

دیال صاحب : اور؟

آرتی : اور انجلی نے شاید فیصلہ کرلیا ہے۔

[دیال صاحب اُداس نظروں سے آرتی کی طرف دیکھتے ہیں۔]

آرتی : ہاں! اور مجھے اُس کی طرف سے اَب کوئی اُلجھن، کوئی چنتا...... نہیں ہے۔ میں نے دیکھا ہے...... رات دیر گئے تک، اس کے کمرے کی کھڑکی کھلی رہتی ہے...... اور وہ اب گئے دنوں کی طرح، اپنے آپ میں ڈوبی ہوئی، اپنے آپ سے اُلجھتی دِکھائی نہیں دیتی۔

[دیال صاحب ایک لمبا سانس لیتے ہیں۔]

[کٹ]

نواں منظر :

[سہ پہر کا وقت...... سڑکوں پر چہل پہل، کھلا آسمان، پرندے، بلراج اور انجلی پارک کی ایک بینچ پر ساتھ بیٹھے...... ہنس ہنس کر باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔]

انجلی : (گھڑی دیکھتے ہوئے چونک کر ہونٹ سکوڑتی ہے) ہائے...... بلراج، دیکھو تو...... چھ بجنے والے ہیں۔

بلراج : پھر؟

انجلی : پھر کیا...... اب اُٹھو، چلتے ہیں۔

بلراج : کہاں؟

انجلی : ارے گھر چلتے ہیں اور کہاں۔

بلراج : تم ابھی بھی اپنی کاریتا میں دبی ہوئی ہو۔

انجلی : کیا کہنا چاہتے ہو تم؟

بلراج : تمہیں شاید اپنی ممی اور ڈیڈی کا ڈر ہوگا۔

انجلی : (مسکرا کر) نہیں۔

بلراج : کیوں؟

انجلی : اُنہیں...... ممی اور ڈیڈی دونوں کو پتا ہوگا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں...... (گمبھیر لہجے میں) چلو، چلتے ہیں۔

[دونوں اُٹھتے ہیں۔ سڑک کی طرف چل پڑتے ہیں۔ دھیرے دھیرے اُن کی شبیہیں چھوٹی ہوتی جاتی ہیں۔]

[ڈیزالو]

[مارو بہاگ کی ایک گت ستار پر......]

○○

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں

آوازیں :

(۱) مرزا صاحب	:	عمر تقریباً پچاس برس
(۲) شکیلہ بیگم	:	مرزا صاحب کی بیگم
(۳) رحمٰن صاحب	:	عمر تقریباً پچاس برس
(۴) حسنیٰ بیگم	:	رحمٰن صاحب کی بیگم
(۵) کلیم	:	مرزا صاحب اور شکیلہ بیگم کے بیٹے
(۶) عالیہ	:	مرزا صاحب اور شکیلہ بیگم کی بیٹی
(۷) منا	:	عالیہ کا چھوٹا بھائی
(۸) آپا جان	:	شکیلہ بیگم کی بڑی بہن
(۹) دولہا بھائی	:	شکیلہ بیگم کے بہنوئی

[ابتدائی موسیقی۔ نشاطیہ اور مضحکہ خیز...... فیڈ آؤٹ کے ساتھ ہی کتوں کے بھونکنے کی آواز...... تانگے کے پہیوں کی چرمراہٹ، گھوڑے کی ٹاپیں اور گھونگروؤں کی جھنکاریں۔]

[اچانک دو بچے ایک ساتھ رونے لگتے ہیں۔]

مرزا صاحب : (بگڑ کر) چپ! چپ! میں کہتا ہوں چپ ہو جاؤ۔

[بچے اور زور سے رونے لگتے ہیں۔]

مرزا صاحب : (زِچ ہو کر) لاحول ولاقوۃ...... میں کہتا ہوں بند کرو یہ ملہار۔ یہ کون سا وقت ہے راگ الاپنے کا؟

[رونے کی آواز تیز تر ہو جاتی ہے۔]

مرزا صاحب : (چیخ کر) چوپ...... چوپ ہو جاؤ بدبختو! نہیں تو سارا محلّہ جاگ جائے گا۔

شکیلہ بیگم : نوج ہے۔ تم اس طرح چپ کراؤ گے تو منا اور منی کاہے کو چپ ہوں گے۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے روتے بچوں کو چپ کرانے کا، میں کہتی ہوں، منے او منے...... چپ ہو جاؤ بیٹے...... اور عالیہ! ذرا منی کو سنبھالے رکھو۔ دیکھ تو کیسی بے حال ہو رہی ہے۔

عالیہ : (چپ کرانے کے لیے چمکارتی ہے) چہ چہ چہ چہ چہ چہ............

[منی روتی ہے، منے کی سسکیاں.......... گھوڑا ہنہناتا ہے]

مرزا صاحب : گھر بھی تو اس اللہ کے بندے نے کہاں لے رکھا ہے؟ پورے تیس منٹ ہو چکے بس اڈے سے چلے ہوئے۔

شکیلہ بیگم : (چمک کر) میں نہ کہتی تھی کہ اللہ کا نام لے کر چپ چاپ گھر میں بیٹھو۔ مگر تمہیں تو رَٹ لگی ہوئی تھی۔ بچوں کے امتحان ختم ہو چکے تھے تو کیا ہوا؟ چین سے اپنے گھر میں رہتے۔

مرزا صاحب : جی ہاں! بڑا چین تھا گھر میں! صبح سے شام تک آٹے دال کا چکر۔ یہ لاؤ...... وہ لاؤ...... اِسے نزلہ ہے...... اُسے زُکام ہے...... میں نے سوچا کچھ دن تو بے فکری سے گزر جائیں۔

شکیلہ بیگم : کیا کہنے ہیں۔ اس بے فکری کے۔ لُو، دھوپ میں دن بھر جھلتے رہے۔ صبح کے نکلے ہوئے ہیں گھر سے۔ پورے سوا سو روپے کرائے پر اُٹھ گئے۔ خدا کی پناہ۔ کس قیامت کا سفر تھا۔ بس کا انجن، وہ تو کہو کہ خدا خدا کر کے گھنٹے بھر میں درست ہو گیا۔ نہیں تو ابھی بھٹک رہے ہوتے۔ لعنت ہے ایسے سفر پر۔

مرزا صاحب : تو گویا کہ میں نے ہاتھ جوڑے تھے! منّت کی تھی تمہاری!! پاؤں پڑے تھے!!! ارے میں نے تو سوچ سمجھ کر رائے دی تھی۔ کچھ روز تمہارے دولہا بھائی کے یہاں کی مہمانی کر لی جائے۔ تم کہہ دیتیں کہ نہیں۔

شکیلہ بیگم : تو کیا میں نے روکا تھا؟

مرزا صاحب : (بھنا کر) جی ہاں روکا تھا۔ مگر یہ نہ سوچا کہ پچھلے سال تمہاری آپا جان نے گرمیوں کے دو مہینے غریب خانے پر معہ پانچ عدد بال بچوں کے ٹھاٹ سے گزارے تھے۔ ناشتے میں انڈے، پراٹھے، سوجی کا حلوہ، صبح و شام دونوں وقت کے کھانے پر کباب، قورمہ، مرغن...... ہفتے میں کم سے کم ایک روز پلاؤ اور فیرنی، کھاٹ کھڑی کر دی ہماری۔ لالہ کا حساب

اس مہینے دو گنا ہو گیا۔ اوپر سے اس کا قرض۔

شکیلہ بیگم : غضب خدا کا۔ چار روز کسی کو دو نوالے کھلا دیے تو اب اس کا حساب نکال رہے ہیں۔

مرزا صاحب : میں کہتا ہوں اے نیک بخت...... آخر اِس میں بُرائی کیا ہے؟ کیا حرج ہے بھلا۔ بس تمہاری آپا جان ہی کو مہمانی کا حق ہے۔ ہمیں نہیں ہے حق اس بات کا۔ کھلایا ہے تو کھائیں گے بھی۔

شکیلہ بیگم : دُوسرے کے حلوے مانڈے پر میری رال نہیں ٹپکتی۔ میں اپنی روکھی سوکھی میں خوش رہتی ہوں۔ خدا کی پناہ آٹھ آٹھ نفر کا قافلہ وہاں پہنچے گا تو کیسا لگے گا؟

مرزا صاحب : اور وہ جو سات جنے ہمارے سر پر قہر بن کر ٹوٹے تھے؟

شکیلہ بیگم : تو اس کا بدلہ لے رہے ہو؟ ہے نا؟

مرزا صاحب : ہاں ہاں بدلہ لے رہا ہوں، کیوں نہ لوں۔ اب بات آگے نہ بڑھاؤ۔ خدا کی قسم پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔

شکیلہ بیگم : خدا کے لیے دُولہا بھائی کے گھر پہنچ کر یہ نہ کہہ دینا۔ مجھے پتا ہے کہ وہ لوگ مغرب بعد ہی کھا پی کر لیٹ جاتے ہیں۔

[گھوڑے کی ہنہناہٹ]

مرزا صاحب : تو کیا وہاں پہنچ کر بھی بھوکے رہیں گے؟

شکیلہ بیگم : میں تو کہہ دوں گی کہ راستے میں کھا پی چکے ہیں۔ اب تو صبح کو دیکھا جائے گا۔

مرزا صاحب : مم...... میں تو صاف کہہ دوں گا کہ مجھے کھانا چاہیے۔

[منا رونے لگتا ہے]

مرزا صاحب : چپ، چپ!

شکیلہ بیگم : غریب کو بھوک لگی ہوگی۔ ڈانٹ کیوں رہے ہو؟

مرزا صاحب : اور مجھ غریب کو بھوک نہیں لگی ہے کیا؟ اے میاں تانگے والے...... دیکھوتو۔ وہ نیم کا پیڑ آیا کہ نہیں......بس اس کے آگے والا مکان ہے۔

[منا روتا ہے۔ تانگہ ٹھہر جاتا ہے۔ سب کے سب نیچے اُترتے ہیں۔]

مرزا صاحب : اچھی طرح دیکھ لو! سب ہیں نا۔ منا، منی، عالیہ، نازیہ، کلیم، علیم۔

شکیلہ بیگم : توبہ ہے۔ تم تو لگتا ہے حاضری لے رہے ہو۔ میں اسباب اُترواتی ہوں۔ تم ذرا زنجیر کھٹکھٹاؤ۔

[مرزا صاحب دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔]

مرزا صاحب : (دُور سے) ززز نجیر......ززز نجیر...... بب بیگم......ارے بیگم!

شکیلہ بیگم : (جھنجلا کر) کیوں گلا پھاڑ رہے ہو.......... آتے ہیں، آتے ہیں۔

مرزا صاحب : یہاں تو قفل پڑا ہوا ہے۔

شکیلہ بیگم : کک کیا......؟ ق...... قفل...... ایں؟

[منا رونے لگتا ہے، کتے بھونکتے ہیں.......... مضحکہ خیز موسیقی کی ایک لہر]

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

[ملے جلے قدموں کی چاپ قریب آتی ہوئی۔]

شکیلہ بیگم : یا خدا...... کمر تختہ ہوگئی۔ گھنٹے بھر سے دروازے پر بیٹھے ہیں۔

مرزا صاحب : (دھیرے سے) ذرا آہستہ بولو...... شاید کوئی اور ہے۔

شکیلہ بیگم : (دھیرے سے) اور کون ہوگا؟ کیا میں گن نہیں سکتی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات۔ کل سات نفر ہیں۔ وہی لوگ ہیں۔ آپا جان کا خاندان۔

[قدموں کی چاپ اور قریب آتی ہے۔]

مرزا صاحب : (گھبرا کر) کک...... کون...... کون صاحب ہیں؟

رحمٰن صاحب : خاکسار کو رحمٰن علی خاں کہتے ہیں۔ معاف کیجیے گا...... حکیم نبی بخش کا دولت کدہ یہی ہے نا؟ کہیں ہم غلط تو نہیں آ گئے؟

شکیلہ بیگم : (آہ بھر کر) یا اللہ!

مرزا صاحب : (جلدی سے) جج جی ہاں! میرے ہم زُلف ہیں حکیم نبی بخش صاحب۔ یہی مکان ہے۔ لل...... لیکن آپ؟

رحمٰن صاحب : میں اُن کا پُرانا دوست ہوں...... مم مگر آپ لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟

مرزا صاحب : (جھنجلا کر) تو کیا قفل توڑ دوں؟ نقب لگاؤں، دیوار پھاند جاؤں؟

رحمٰن صاحب : (گھبرا کر) قفل؟ تو کیا آپ کا مطلب ہے قفل...... یعنی تالا؟

مرزا صاحب : جی ہاں! تالا پڑا ہوا ہے۔ لل...... لیکن آپ؟

رحمٰن صاحب : (دھیرے سے) حضرت! آپ کچھ بتا سکتے ہیں کہ حکیم صاحب کب تک واپس آئیں گے؟

مرزا صاحب : مم مجھے کیا پتا...... میں تو خود نو وارد ہوں۔ مگر آپ...... آپ لوگ؟

رحمٰن صاحب : (جلدی سے) یہ میری اہلیہ ہیں حسنٰی بیگم اور یہ میرا بڑا بیٹا ہے سہیل بارہویں میں پڑھتا ہے ماشا اللہ...... بہت ذہین ہے...... اوّل نمبر سے پاس ہوا تھا دسویں میں...... اور یہ دُوسرا بیٹا طفیل۔ اب کے نویں جماعت میں گیا ہے۔ کھلنڈرا ہے ذرا...... میں کہتا ہوں کھیل کود سے زیادہ پڑھائی کام آئے گی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور یہ تیسرا بیٹا...... وکیل...... خدا نے چاہا تو بیرسٹر بنے گا۔ بڑا قانونی مزاج پایا ہے اس نے...... اور یہ......

مرزا صاحب : (غصہ دبانے کی کوشش کرتے ہوئے) افوہ! آپ تو اپنے خاندان کی

تاریخ بیان کرنے لگے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ......

رحمٰن صاحب : (جلدی سے) میں ضلع ہردوئی میں پیشکار ہوں۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے گھر میں۔ زمین جائیداد، آموں کا باغ، ابھی پچھلے برس آموں کی فصل......

مرزا صاحب : (بات کاٹ کر) خدا کی پناہ۔ آپ وہی تاریخ بیان کرنے لگے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اِس وقت آپ سب یہاں کیسے تشریف لائے؟ اِس زحمت کا کیا سبب؟

رحمٰن صاحب : ارے جناب زحمت کیا۔ اپنوں سے تکلف کیسا؟ حکیم صاحب کا قدیمی نیازمند ہوں۔ گرمی کی تعطیلات تھیں۔ سوچا بچوں کو ذرا لکھنؤ کی سیر کرا دوں۔ اس شہر میں جب بھی آنا ہوتا ہے، حکیم صاحب کی میزبانی کا لطف اُٹھاتا ہوں۔ بڑے وضع دار بزرگ ہیں۔ بچپن کے دوست ہیں، کہیں اور جانے نہیں دیتے۔ مگر اس وقت یہ قفل؟

مرزا صاحب : (طنزاً) جی ہاں۔ اس وقت تو قفل پڑا ہے اپنی قسمت پر۔ ہم گھنٹے بھر سے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دن بھر کا سفر، اس پر یہ انتظار کی مصیبت۔

رحمٰن صاحب : تو کیا آپ لوگ بھی باہر سے تشریف لائے ہیں؟

مرزا صاحب : جی ہاں، خاکسار کا وطن فیض آباد ہے۔

رحمٰن صاحب : سبحان اللہ...... کیا کہنے ہیں فیض آباد کے۔ وہاں کے امرودوں کا جواب نہیں۔ اور صاحب چوک کے بازار میں عیدو حلوائی کی دُکان ابھی وہاں ہے نا! اس کے یہاں کیا نفیس بالائی ملتی ہے۔ اب بھی ملتی ہوگی۔ کیوں؟

مرزا صاحب : (طنزاً) جی ہاں! ملتی ہے۔ کبھی فیض آباد تشریف لایئے تو کھایئے گا۔ لیکن اس وقت تو یہ قفل......!

رحمٰن صاحب : کیا قیامت ہے۔ ہمیں تو اسٹیشن سے یہاں تک پیدل آنا پڑا۔ کوئی

یکہ تانگہ بھی نہیں ملا اور اب یہ مصیبت۔

مرزا صاحب : جی ہاں! عجیب مصیبت ہے۔ خدا جانے کہاں گئے ہوئے ہیں یہ لوگ؟

رحمٰن صاحب : میرا خیال ہے کسی تقریب میں گئے ہوں گے۔ کسی دعوت میں یا شادی بیاہ میں...... اُڑا رہے ہوں گے پلاؤ...... قورمہ...... شاہی ٹکڑے...... کباب...... قلیہ...... شیر مال...... نان!

[منا رونے لگتا ہے]

رحمٰن صاحب : میرا خیال ہے کہ صاحبزادہ بھوک سے نڈھال ہو رہا ہے۔

مرزا صاحب : بھوک سے تو اس کا باپ بھی نڈھال ہو رہا ہے، پھر یہ کیوں نہ ہوگا۔

رحمٰن صاحب : تو کیا حکیم صاحب کو آپ کی آمد کا پتا نہیں تھا؟

مرزا صاحب : جی نہیں! وہ میرے عزیز ہیں۔ انہیں اطلاع دے کر آنے کی کیا ضرورت تھی ہمیں...... لل لیکن آپ؟

رحمٰن صاحب : میں نے تو خط لکھ دیا تھا حکیم صاحب کو کوئی چار روز پہلے۔ حیرت ہے شاید خط نہیں ملا ورنہ اس وقت گھر پر ہوتے۔ دعوت میں جانا ایسا ہی ضروری ہوتا تو ہماری آمد کے بعد ہمیں ساتھ لے کر جاتے۔ اُڑا رہے ہوں گے مرغ...... بریانی...... کباب...... قورمہ...... زردہ......

مرزا صاحب : شاید آپ بھی بھوکے ہیں! ہیں نا؟ سفر میں......

رحمٰن صاحب : جی ہاں۔ سفر میں بُرا حال ہو گیا ہے ہمارا۔ خیر، اب انتظار کے سوا چارہ کیا ہے۔ یوں ہی ہم نے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے بہت ڈٹ کر خاگینہ اور روغنی روٹی اور کباب اور آلو کی ترکاری......

مرزا صاحب : حضت...... آپ بہت بھوکے معلوم ہوتے ہیں۔

[منا رونے لگتا ہے۔ مضحکہ خیز موسیقی کی ایک لہر]

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

[پس منظر میں ریلوے اسٹیشن کا شور۔ انجن کی چھک چھک...... قلیوں کی آوازیں]

حسنیٰ بیگم : (جمائی کے ساتھ) یا اللہ...... ہر حال میں تیرا شکر ہے۔ یہ عذاب بھی اپنی قسمت میں لکھا تھا۔

شکیلہ بیگم : اے بہن شکر کرو کہ کسی طرح لشٹم پشٹم اسٹیشن پہنچ گئے۔ اے یہاں کم سے کم آدمی زادوں کی صورت تو نظر پڑ رہی ہے۔ اُس ویرانے میں کب تک پڑے رہتے۔

حسنیٰ بیگم : ہاں، اور نہیں تو کیا...... دو گھنٹے حکیم صاحب کی ڈیوڑھی کے دربان بنے رہے۔ میں تو رحمٰن صاحب سے پہلے ہی کہتی تھی کہ اپنے گھر بیٹھیں۔ مگر اُنہیں تو سیر تفریح کی سوجھی تھی۔ دیکھ لیا اس کا انجام...... بھر پایا۔ اب ہمیشہ کے لیے کان پکڑتی ہوں اور تم بھی مرزا صاحب سے کہو کہ آگے کے لیے توبہ کر لیں۔

شکیلہ بیگم : میرا خیال ہے کہ دُولہا بھائی اور آپا جان کہیں باہر چلے گئے ہیں۔ ورنہ اب تک تو واپس آ گئے ہوتے۔

حسنیٰ بیگم : لیکن ہمیں پاس پڑوس میں کسی سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔

شکیلہ بیگم : پوچھتے کس سے؟ پڑوس میں جو صاحب تھے، اُنہیں کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ پھر کیا کرتے؟ سوائے اس کے کہ تھک ہار کر اسٹیشن آ گئے۔ آپ کو ہردوئی کی گاڑی کب ملے گی؟

حسنیٰ بیگم : سویرے پانچ بجے۔

شکیلہ بیگم : اور ہماری گاڑی چھ بجے آئے گی۔ فیض آباد کے لیے۔

حسنیٰ بیگم : کب سے تمباکو کی طلب لگی ہوئی ہے۔ موئے یہ اسٹیشن کے پان والے چار آنے کی ایک گلوری دیتے ہیں۔ پان بھی ایسے جیسے بکری کا پتا

چبا رہے ہوں۔ خدا کی مار پڑے اُٹھائی گیروں پر۔

رحمٰن صاحب : (دُور سے) یہ کس پر خدا کی مار بھیج رہی ہو حسنیٰ بیگم؟

حسنیٰ بیگم : (خفا ہو کر) بس بس بیٹھے رہیے۔ آپ ہی کی ضد نے یہ دن دِکھایا، نہیں تو اپنے گھر میں چین سے خراٹے لے رہے ہوتے۔ پھر میں تو کہتی ہوں کہ کیا عجب ہمارے چلتے ہی حکیم صاحب آ گئے ہوں۔

رحمٰن صاحب : تو کیا ڈگڈگی پٹواتا؟ شہر میں منادی کرواتا۔ پڑوسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔ کیا ضروری ہے کہ حکیم صاحب شہر بھر میں اعلان کرنے کے بعد کہیں گئے ہوں۔ کہیں آس پاس دعوت تقریب میں گئے ہوتے تو گیارہ بارہ بجے تک لوٹ آئے ہوتے۔

حسنیٰ بیگم : تو میں کب کہتی ہوں کہ وہ شہر میں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہیں مہمانی کے مزے لے رہے ہوں؟ بال بچوں سمیت کسی عزیز رشتے دار کی طرف نکل گئے ہوں۔

شکیلہ بیگم : گئے برس تو وہ ان ہی دنوں ہمارے یہاں آئے تھے۔ بال بچوں سمیت۔ ابھی پچھلے ہفتے ان کا خط مرزا صاحب کے پاس آیا تھا۔ اس میں تو کہیں جانے کا ذکر نہیں تھا۔ شاید اچانک ہی چل پڑے ہوں۔ اللہ نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات......

مرزا صاحب : (دُور سے) ارے، جہاں بھی ہوں گے، چین سے ہوں گے ہماری جیسی حالت تھوڑی ہی ہو رہی ہوگی۔ پلاؤ، قورمہ، کھا کر چین کی نیند سو رہے ہوں گے اس وقت، اور ہم ہیں کہ اس نابکار ریلوے اسٹیشن پر ایک پیالی چائے بھی......

رحمٰن صاحب : اجی مرزا صاحب لاحول بھیجئے اس چائے پر۔ حقے کا پانی معلوم ہوتی ہے۔ میرا تو منہ کا مزہ بگڑ گیا۔ اسی لیے تو میں نے آپ کو پیش نہیں کی۔ کہیے تو......

مرزا صاحب : معاف فرمایئے مجھے رحمٰن صاحب! میں نے تو وہ مٹر کی چاٹ کا دونا کوڑے دان میں پھینک دیا۔ بہت بدمزہ تھا۔ یوں اگر آپ کہیں تو.......

شکیلہ بیگم : (دور سے) ذرا سنیے۔

[قدموں کی چاپ]

مرزا صاحب : کیا بات ہے بیگم؟

شکیلہ بیگم : (سرگوشی میں) یہ آپ دونوں ہاتھوں سے لٹانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ مان لیجیے کہ موئے رحمٰن صاحب ہاں کر دیتے تو؟ پورے سات نفر ہیں۔ سات دونے منگوانے پڑتے۔

مرزا صاحب : (سرگوشی میں) بہت کائیاں ہیں حضرت۔ اکیلے چائے پی لی۔

شکیلہ بیگم : کیوں نہ پیتے؟ آخر ہمارے ساتھ بھی فوج کی فوج ہے۔ منے اور منی کو چھوڑ دو جب بھی کم سے کم ادھی درجن پیالیاں ان کے متھے جاتیں۔

مرزا صاحب : تم ایسا کرو بیگم (رازدارانہ انداز میں) وہ جو مٹھائی کا ڈبہ آپا کے لیے لائی ہو، مجھے دے دو۔ ایک آدھ لڈو اُسی میں سے کھا لوں، خدا کی قسم حالت خراب ہے۔

شکیلہ بیگم : ہرگز نہیں۔ میں یہ لاکھ برس نہیں ہونے دوں گی۔ رحمٰن صاحب کی نظر پڑ گئی تو پورا ڈبا صاف ہو جائے گا۔ ابھی ذرا دیر پہلے میں نے منے کو ایک لڈو دیا تو سب ندیدوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔

مرزا صاحب : اچھا ٹھیک ہے...... اُنہیں ہردوئی کے لیے دفعان ہونے دو۔ اس کے بعد کھالیں گے۔

شکیلہ بیگم : ٹھیک ہے۔

[اسٹیشن کی گھنٹی بجتی ہے۔ گاڑی آتی ہے، پلیٹ فارم کا شور۔]

مرزا صاحب : رحمٰن صاحب...... اجی او رحمٰن صاحب۔ حضت آپ تو اونگھ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ آپ کی گاڑی ہے۔

رحمٰن صاحب : (جمائی لے کر) میری گاڑی...... جج جی ہاں...... حسنیٰ بیگم...... حسنیٰ بیگم!

حسنیٰ بیگم : جی!

رحمٰن صاحب : (پکارتے ہوئے) سہیل، طفیل، وکیل...... ا...... ارے اُٹھو تم سب۔ گاڑی آگئی...... چلو...... جلدی کرو۔

[ملی جلی آوازیں۔ خوانچہ فروشوں کی آوازیں]

مرزا صاحب : اچھا بھائی رحمٰن صاحب، خدا حافظ!

رحمٰن صاحب : خدا حافظ!

حسنیٰ بیگم : خدا حافظ شکیلہ بہن، کیسی مسافرت کی ملاقات رہی۔

شکیلہ بیگم : خدا حافظ حسنیٰ بیگم!

[ریل گاڑی کی سیٹی بجتی ہے۔ انجن کی چھک چھک]

[فیڈ آوٹ]

[مضحکہ خیز موسیقی کی ایک لہر کے ساتھ کوے کی کائیں کائیں]

منا : (تتلاتے ہوئے) ابی جی کوا۔

مرزا صاحب : کیا بکتا ہے نانجار...... باپ کا مذاق اُڑاتا ہے۔ اپنی صورت دیکھی ہے آئینہ میں؟

شکیلہ بیگم : ہے ہے...... تم تو اس غریب کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔ وہ کیا غلط کہہ رہا ہے۔

مرزا صاحب : (ڈپٹ کر) شکیلہ بیگم...... یہ ہنسی دل لگی کا وقت نہیں ہے۔ مانا کہ میری رنگت بقول تمہارے اُلٹے توے جیسی ہے، مگر خود تم کہاں کی حور پری ہو؟ ایں!

[عالیہ کی دبی دبی سی ہنسی]

شکیلہ بیگم : (فریادی لہجہ) یا خدا...... رات اذیت میں کٹی...... جیسے گئے تھے ویسے ہی اُلٹے پاؤں لوٹ آئے۔ اب گھر پہنچے ہیں تو یہ قیامت (اچانک چمک کر) اے میں کب کہتی ہوں کہ میں حور پری ہوں؟ لے آئے ہوتے کوئی ڈھونڈ کر۔ اشتہار چھپوایا ہوتا اخبار میں کہ اپنے جیسی حسین صورت......

مرزا صاحب : (چیخ کر) بب بیگم...... خدا کی قسم چپ ہو جاؤ نہیں تو............

[کوا کائیں کائیں کرنے لگتا ہے، عالیہ دُور سے ہنستی ہے]

مرزا صاحب : (بگڑ کر) کھی کھی کھی...... کھی کھی کھی...... بتیسی نکلی ہوئی ہے۔ سور کہیں کی۔

شکیلہ بیگم : (روہانسی ہو کر) عالیہ!

عالیہ : جی امی!

شکیلہ بیگم : اری بدبخت ہوش میں آ...... نہیں تو یہ بکھان کر رکھ دیں گے۔ ان کی زبان کو لگام نہیں۔ کہتے ہیں میں حور پری نہیں ہوں۔ نہ سہی، خود کون سے یوسفِ زماں ہیں۔ غضب خدا کا...... چھ چھ بچوں کے باپ اُس پر یہ رنگ ڈھنگ، یہ صلواتیں۔

مرزا صاحب : ہاں ہاں کہوں گا۔ سو دفعہ کہوں گا۔ اپنے چار برس کے لاڈلے سے کیوں نہیں کہتیں۔ بدتمیز کہیں کا، کہتا ہے ابی جی کوّا۔

[کوے کی کائیں کائیں]

شکیلہ بیگم : (اُسی انداز میں) ارے تو کیا غلط کہتا تھا۔

مرزا صاحب : گویا کہ بب بیگم...... اس لونڈے نے جو کہا، تم سمجھتی ہو کہ صحیح کہا۔

شکیلہ بیگم : ہاں ہاں صحیح کہا۔ دُنیا جہان سے پوچھ لو۔ یہ چھت کی منڈیر پر کوّا نہیں تو کیا بلبل ترانے الاپ رہے ہیں؟

[کوّے کی کائیں کائیں]

مرزا صاحب : (دھیرے سے) اوہ...... تو یہ کوّے کو...... گویا کہ اس منڈیر والے

کوے کو......

شکیلہ بیگم : (جلدی سے) اور نہیں تو کیا؟

مرزا صاحب : (پھسلانے کے انداز میں) عالیہ بیٹی...... میری بیٹی ذرا ایک کام کر!

عالیہ : جی ابی!

مرزا صاحب : گھر میں کچھ گھی ہوگا؟

عالیہ : شاید ہے۔

مرزا صاحب : اور آٹا بھی ہے۔

عالیہ : شاید ہے۔

مرزا صاحب : (جھنجلا کر) یہ شاید شاید کیا لگا رکھا ہے۔

شکیلہ بیگم : ہے ہے...... تم کیسی اُلٹی مت رکھتے ہو۔ ماشا اللہ سے اتنے نفر کھانے والے۔ اگر تھوڑا بہت بھی بچا کھچا ہو تو غنیمت جانو۔

مرزا صاحب : تھوڑا بہت کیوں؟ ابھی ہفتہ بھر پہلے سیر بھر گھی میں خود لایا تھا۔ پندرہ سیر آٹا پسوایا تھا۔

شکیلہ بیگم : (سوالیہ لہجہ) تو؟

مرزا صاحب : تو کیا؟ وہ سب تم لوگ چٹ کر گئے ہفتہ بھر میں؟

شکیلہ بیگم : چٹ کریں میرے دشمن۔ میں تو صبح شام بس ایک ایک چپاتی کی گناہگار ہوں۔

مرزا صاحب : تو کیا شیطان کھا گئے؟

شکیلہ بیگم : (غصہ میں) اب اپنے آپ کو جو چاہو، نام دو۔

مرزا صاحب : (چیخ کر) مم مطلب؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟

شکیلہ بیگم : خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہنا۔ سات دن صبح و شام تم نے پراٹھے اُڑائے ہیں کہ نہیں؟ میں لاکھ کہتی تھی کہ گھر کا خرچہ بڑھا رہے ہو، مگر سو بات کا ایک جواب۔

مرزا صاحب : کک کیا جواب...... کیسا جواب؟

شکیلہ بیگم : یہی کہ دو ہفتے آپا جان کے گھر تر مال ملے گا۔ اپنے گھر پر کچھ بچانے کی ضرورت کیا ہے۔ حلق تک ٹھونس ٹھونس کر پراٹھے کھائے گئے، دو ہفتے جو مفت خوری کرنی تھی۔ دُوسرے کی جیب پر ڈاکہ ڈالنا تھا۔

مرزا صاحب : تو میں مفت خورا ہوں...... میں چور ہوں...... اُچکا ہوں...... مر بھکا ہوں؟

شکیلہ بیگم : تو میں غلط کہہ رہی ہوں؟ تم نہیں کہتے تھے کہ آپا جان کے یہاں مداراتیں ہوں گی۔ حلوے، پراٹھے، پلاؤ، قورمہ، فیرنی، (طنزاً) ماشاءاللہ...... خوب مل گیا۔

مرزا صاحب : (مصالحت کے انداز میں) پلاؤ، قورمہ، فیرنی، حلوے، پراٹھے۔ بیگم تمہاری باتیں سنتے ہی بھوک چمک اُٹھی۔ ذرا جلدی سے انتظام کرو۔ رات بھر پیٹ میں چوہے دوڑتے رہے۔ انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھتی رہیں۔

شکیلہ بیگم : ذرا دم تو لے لو۔ ابھی گھر میں قدم رکھا ہے۔

مرزا صاحب : کلیم...... او کلیم......!!

کلیم : جی ابی!

مرزا صاحب : (ٹھہر کر) یہ لے دس روپے۔ نکڑ کی دُکان سے انڈے لے آ۔ اور پاؤ بھر گھی اور دو سیر آٹا...... اور ہاں...... لالہ کی دُکان پر اس وقت تر تراتی ہوئی جلیبیاں اُتر رہی ہوں گی۔ آدھ سیر جلیبیاں بھی لیتے آنا.........

منا : (بسورتے ہوئے) میں جلیبی کھاؤں گا۔

مرزا صاحب : (ڈپٹ کر) کھا لینا، کھا لینا، نیت کے مارے ندیدے۔ ابھی جلیبیاں آئی نہیں اور رال ٹپکنے لگی۔

[منا روتا ہے]

شکیلہ بیگم : (چمکارتے ہوئے) چہ چہ چہ...... چپ ہو جاؤ بچے۔ ابھی جلیبیاں منگوائی ہیں۔ سب سے زیادہ تم کو دوں گی۔

مرزا صاحب : کک کیا مطلب؟ تم میرے لیے......

شکیلہ بیگم : (طنزاً) سچ کہنا...... ندیدا کون ہے؟ تم کہ منا؟

مرزا صاحب : ہاں ہاں...... میں ہی ندیدا ہوں۔ ٹھیک ہے۔ مم مگر جلیبیاں میں نے اپنے لیے منگوائی ہیں۔ بس، ایک ایک جلیبی ہر بچے کو ملے گی۔

[منا رونے لگتا ہے]

شکیلہ بیگم : (فریادی لہجہ) میرے خدا یہ کیسی مصیبت ہے۔ کمر ٹوٹ گئی اس موئے سفر میں۔ گھر پہنچ کر بھی وہی چخ چخ...... عالیہ بیٹی! ذرا چولہا سلگا دے۔

عالیہ : جی امی!

مرزا صاحب : او کلیم......!!

کلیم : جی ابی۔

مرزا صاحب : یہ لو دس کا نوٹ...... میں نے کیا کیا کہا تھا، لانے کے لیے۔

کلیم : انڈے!

مرزا صاحب : اور......؟

کلیم : اور گھی......!

مرزا صاحب : (رسیلے لہجے میں) اور؟ اور؟

کلیم : اور آٹا!

مرزا صاحب : اور......اور؟

کلیم : جلیبیاں......آدھ سیر جلیبیاں!

مرزا صاحب : (خوش ہوکر) شاباش...... ہاں تو جلدی جا اور جلدی لوٹ آ۔ بیگم پراٹھے تم تلوگی۔ تمہارے ہاتھ میں جو مزہ ہے......

شکیلہ بیگم : تر مال کا خیال آیا اور زبان سے شیرہ ٹپکنے لگا۔ زیادہ چونچلے مت بگھارو۔
مرزا صاحب : کلیم! اے کلیم!! تو ابھی گیا نہیں۔ چیزیں لانے کے لیے۔
کلیم : جاتا ہوں ابی جی!
[کلیم جاتا ہے]
مرزا صاحب : اور عالیہ...... او عالیہ...... بیٹی آگ جلا دے ذرا لپک کر!
عالیہ : جلاتی ہوں۔
[عالیہ جاتی ہے]
[وقفہ............ مضحکہ خیز موسیقی کی ایک لہر]
مرزا صاحب : دس منٹ سے زیادہ گزر گئے۔ کلیم ابھی تک واپس نہیں آیا۔
شکیلہ بیگم : اب ایسی بھی کیا بے صبری۔ آجائے گا...... آجائے گا۔
مرزا صاحب : (پُرخیال انداز میں) ہاں آں...... اصل میں لالہ کی دُکان پر بھیڑ ہوگی۔ جلیبیوں کے شوقین بھیڑ لگا دیتے ہیں اور خدا کی قسم...... کیسی سرخ سرخ، گلابی گلابی، سوندھی سوندھی جلیبیاں تلتا ہے۔
منا : (بسور کر) میں بھی جلیبی کھاؤں گا۔
شکیلہ بیگم : ابھی گھر میں جلیبیاں آئی نہیں اور کھانے کی رٹ لگ گئی۔
[بیرونی دروازے پر ملے جلے قدموں کی چاپ...... گھوڑے کی ٹاپیں...... تانگہ رُکنے کی آواز۔ گھنگھرو بجتے ہیں۔]
مرزا صاحب : (گھبرا کر) بب بیگم...... بب بیگم!
شکیلہ بیگم : (جل کر) کیا ہے؟
مرزا صاحب : سس سن رہی ہو، سن رہی ہو نا! شاید ہمارے دروازے پر کوئی تانگہ رُکا ہے۔
شکیلہ بیگم : اونہہ...... ہوگا کوئی پڑوس میں۔ تمہیں کاہے کی فکر لگی ہوئی ہے؟

مرزا صاحب : (مطمئن ہو کر) تم شاید ٹھیک کہتی ہو۔ میں تو ڈر گیا تھا۔ بلاوجہ ڈر گیا تھا۔ میں نے سوچا یہ صبح صبح کون اُٹھائی گیرا آن وارد ہوا۔

[بیرونی دروازہ کھلتا ہے۔ قدموں کی چاپ]

دولہا بھائی : (دُور سے) ارے بھائی مرزا...... یہ ہم ہیں...... خوب سواگت کیا تم نے، نہ سلام نہ دُعا...... کہہ رہے ہو یہ کون اُٹھائی گیرا آن وارد ہوا۔

شکیلہ بیگم : (اُچھل کر) دولہا بھائی!

[پاس آتے ہوئے قدموں کی چاپ]

شکیلہ بیگم : اور آپا جان......! آداب!

آپا جان : ہاں ہاں ہم ہیں۔ ہم ہیں...... مگر کس پر صلواتیں بھیجی جا رہی ہیں صبح صبح؟

منا : (اُچھل اُچھل کر گاتے ہوئے) خالہ امی آگئیں، خالہ امی آگئیں، خالہ امی آگئیں۔

عالیہ : آداب خالہ امی!

مرزا صاحب : (گھبرا کر) مم مگر...... مگر آپ لوگ؟

دولہا بھائی : ارے میاں مرزا...... تم تو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو جیسے ہمارے سروں پر سینگ نکل آئے ہیں۔ خدا نہ کرے...... طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟

مرزا صاحب : ٹھٹ...... ٹھیک ہوں...... ٹھیک ہوں، تو کیا آپ سب لوگ؟

دولہا بھائی : ہاں ہاں سب ہیں۔ رشید، وحید، سعید، طاہرہ، ہاجرہ، تمہاری آپا جان، سب ہیں۔ (ہنستے ہوئے) اما تو کیا بچوں کو یتیم خانے میں چھوڑ کر آتے؟

آپا جان : سچ جانو، شکیلہ جب سے ان بچوں کے امتحان ختم ہوئے ہیں، ایک ہی رٹ لگی ہوئی تھی کہ خالہ جان خالو جان کے پاس چلو۔ بس ایک ہی رٹ کہ چلو، چلو۔

دولہا بھائی : میاں! مطب بند کرنے سے جو نقصان ہوتا ہے، تم خود بھی سمجھ سکتے ہو۔ لیکن کیا کروں، بچوں کی ضد؟

آپا جان : ہاں اور نہیں تو کیا۔ بچوں کی ضد کے آگے ہم نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ تو خیر ہفتہ بھر رک کر چلے جائیں گے۔ بچے یہاں اپنی چھٹیاں گزار لیں گے۔

شکیلہ بیگم : مم مگر آپا جان!

آپا جان : اے ہے...... ذرا سکھ کا سانس تو لینے دو۔ اس سفر نے ہلکان کر دیا۔

شکیلہ بیگم : سس سفر؟

آپا جان : ہاں ہاں...... سفر جیسا سفر تھا؟ رات جنگل میں بسر ہوئی۔

مرزا صاحب : جج جنگل میں؟

دولہا بھائی : اما مجھ سے سنو۔ ہم تو کل شام ہی یہاں پہنچ گئے ہوتے۔ سات آٹھ بجے تک۔ مگر وہ کمبخت لاری تھی کہ کھٹارا۔ بیچ جنگل میں انجن نے جواب دے دیا۔ وہ تو کہو کہ تمھاری آپا جان تم سب کے لیے ایک ٹوکری زرد زرد دسہریوں کی، ایک شیشی نورتن چٹنی کی، ایک درجن باقر خانیاں تم سب کے لیے بطور سوغات لا رہی تھیں۔ اماں وہ مال تو ہمارے معدوں میں پہنچ گیا۔ نہیں تو بے موت مر جاتے۔ ذرا سوچو! جنگل، بیابان، گھر نہ دُکان، بے بسی کا عالم۔ کوئی پُرسان حال نہیں۔ صبح ہوتے ہوتے انجن کے لیے دوسرا پمپ شہر سے آیا تو ہم روانہ ہوئے۔ پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ تختے جیسی سیٹیں...... میں تو کہتا ہوں اس لاری موٹر سے اپنی ریل بھلی۔ لل...... لیکن (چونک کر) یہ تمھارا اسباب بندھا کیوں رکھا ہے؟ کیا کہیں جانے کی تیاری تھی؟

مرزا صاحب : (نڈھال ہو کر) نہیں بھائی صاحب، کہیں نہیں۔ یہ تو ہم واپس آئے ہیں۔

دولہا بھائی : واپس...... کہاں سے واپس؟

مرزا صاحب : لکھنؤ سے۔

آپا جان : (چونک کر) لکھنو...... یعنی کہ لکھنؤ!

دولہا بھائی : (بناوٹی غصے سے) کک کک کیا کہا؟ لکھنؤ...... یعنی کہ ہمارا لکھنؤ! بہت خوب، بہت خوب! جناب والا لکھنؤ کی سیر کر آئے اور ہمیں خبر نہ ہوئی۔ ہاں ہاں! ہم تو غیر ہیں۔ پرائے ہیں۔ اجنبی ہیں۔

[اچانک چپ ہو جاتے ہیں۔ کلیم اندر آتا ہے]

کلیم : خالہ امی آداب...... خالو جان آداب!

دولہا بھائی : (لہک کر) اوہو...... کلیم میاں ہیں...... اور دونے میں کیا ہے؟

کلیم : (شرماتے ہوئے) جلیبیاں ہیں۔

دولہا بھائی : جلیبیاں...... یعنی کہ تازہ تازہ گرم گرم سوندھی سوندھی جلیبیاں...... سبحان اللہ۔ ذہین بچے ہیں، ماشا اللہ...... اما مرزا...... تو تمہیں خبر ہو گئی تھی ہمارے آنے کی پہلے ہی سے...... واہ!

[منڈیر پر کوے کی کائیں کائیں]

دولہا بھائی : (ہنس کر) اے میاں کوے...... تمہیں جن کا انتظار تھا وہ آ گئے۔ ہم آ گئے۔ (ہنستے ہیں) کیوں مرزا، کیسا رہا یہ شگون؟

مرزا صاحب : کک کلیم بیٹے...... ذرا پپ پانی لاؤ...... پانی...... گلا خشک ہو رہا ہے۔

[منڈیر پر کوے کی مسلسل کائیں کائیں۔ اِسی کائیں کائیں کی آواز پر مضحکہ خیز موسیقی کی ایک طویل لہر۔]

[فیڈ آؤٹ]

○○

نیند

نیند

کردار :

(۱) سامیہ	:	ایک خواب پرست لڑکی
(۲) عاصم	:	ایک خواب پرست نوجوان
(۳) اباجی	:	سامیہ کے والد
(۴) ناصر میاں	:	عاصم کے والد
(۵) سہیلہ	:	عاصم کی بہن
(۶) چچی امی	:	سہیلہ کی چچی

[ابتدائی موسیقی...... تیز رفتار اور ڈراؤنی]

[فیڈ آؤٹ سے پہلے دُور کہیں کسی عورت کی چیخ سنائی دیتی ہے۔ پھر تیز تیز سانسیں...... بیچ بیچ میں سامیہ کے کراہنے کی آواز]

ابا جی : (دروازے کو تھپتھپاتے ہوئے) سامیہ! بیٹے سامی...... سامیہ!

سامیہ : (تیز تیز سانسوں کے درمیان پھنسی پھنسی سی آواز میں) جی! ابا جی...... ابا جی!

ابا جی : (پکارتے ہوئے) بیٹی سامیہ...... دروازہ کھولو...... دروازہ کھولو۔

[سامیہ دروازہ کھولتی ہے]

سامیہ : (بھرائی ہوئی آواز میں) ابا جی! ابا جی!!

ابا جی : کیا ہوا بیٹے......؟ کتنی بار کہا، دروازہ اندر سے مت بند کیا کرو۔ تم سوتے میں اکثر ڈر جاتی ہو۔

سامیہ : سوتے میں؟

ابا جی : ہاں، اور نہیں تو کیا؟ دروازہ کھول کر سویا کرو۔

سامیہ : سویا کروں؟

ابا جی : افوہ! ہاں ہاں، دروازہ کھول کر سویا کرو۔ اندر سے چٹخنی مت لگاؤ۔ تم سوتے میں ڈر جاتی ہو۔

سامیہ : مم.....مگر میں سوتی کہاں ہوں ابا جی!

ابا جی : یہ اور لو! تم سو نہیں رہی تھیں؟ خواب میں ڈری نہیں تھیں؟ چیخی نہیں تھیں؟

سامیہ : میں سو نہیں رہی تھی ابا جی!

ابا جی : پھر کیا؟ کیا جاگ رہی تھیں؟

سامیہ : ہاں، جاگ رہی تھی۔

ابا جی : اور جاگتے میں چیخ نکل گئی تھی؟

سامیہ : چیخ؟ کس کی چیخ؟ کب؟ کہاں؟

ابا جی : تم چیخی تھیں! ابھی چیخی تھیں۔ اسی کمرے میں چیخی تھیں۔

سامیہ : مگر..... (پُرخیال انداز میں) میں تو جاگ رہی تھی۔ جاگ رہی تھی ناں۔ مجھے نیند آئی ہی نہیں رات کو..... میں تو ساری رات نہیں سوئی...... کبھی نہیں سوتی۔

ابا جی : تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا.....؟ (چمکارتے ہوئے) سامی بیٹے! کل سے تم میرے کمرے میں سوؤ گی۔ اکیلے نہیں سوؤ گی۔ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو پھر میں رات بھر جاگوں گا اور تمہارے دروازے پر پہرا دوں گا۔

سامیہ : (ڈری ڈری سی ہنسی) ابا جی! آپ ناحق گھبرا جاتے ہیں ذرا سی بات پر۔

ابا جی : تم اسے ذرا سی بات کہتی ہو؟

سامیہ : اور نہیں تو کیا..........؟

ابا جی : تو تم چیخی نہیں تھیں؟

سامیہ : نن.....نہیں!

ابا جی : پھر؟ پھر وہ کس کی آواز تھی؟ ہو بہو تمہاری جیسی! میں جاگ رہا تھا اور میں نے اپنے کانوں سے وہ آواز سنی تھی۔

سامیہ : آپ جاگ رہے تھے؟ کیوں جاگ رہے تھے؟

اباجی : میں تو ہر روز صبح ساڑھے چار بجے تک جاگ اُٹھتا ہوں۔ آج بھی اُٹھ گیا تھا۔ منہ ہاتھ دھو چکا تھا۔ چائے بنا کر پی لی تھی۔ فجر کی نماز پڑھ لی تھی۔

سامیہ : (حیرت سے) ایں...... تو کیا صبح ہو گئی؟

اباجی : ہاں! تمہارے کمرے سے باہر...... وہ دیکھو...... کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھو، اُجالا دھیرے دھیرے پھیل رہا ہے۔ پرندے بھی جاگ چکے اور وہ دیکھو، ندی کا پانی اس اُجالے میں کیسا چمک رہا ہے۔ ہم، مگر...... وہ چیخ کس کی تھی؟

سامیہ : بتاؤں؟

اباجی : ہاں بتاؤ......!

سامیہ : پانی کی! میرا مطلب ہے ندی کی...... کبھی کبھی پانی کی کوئی لہر اچانک چیخ اُٹھتی ہے۔

[پس منظر سے ہوا کا تیز جھونکا...... پیپل کے پتوں کا شور، پرندوں کے چہچہے، موسیقی کی ایک تیز لہر......]

[فیڈ آؤٹ]

[حقے کی گڑگڑاہٹ...... مسلسل......]

ناصر میاں : ہاں تو بھائی سعادت حسین؟ سمجھ میں آئی میری بات؟ اگر اب تک نہیں سمجھے تو اب سمجھنے کی کوشش کرو۔ بھابی صاحبہ کے بعد میں نے کتنا کہا، گھر بسا لو، گھر بسا لو، مگر تم نے ایک نہ مانی! پھر میں نے کہا......

اکیلے ہی رہنا ہے تو بیٹی کو ہاسٹل میں داخل کرا دو، وہاں اپنی ہمجولیوں میں رہے گی، بہلی رہے گی، عام لڑکیوں کی طرح وقت گزارے گی، گھومے پھرے گی، گپ شپ کرے گی، کھیلے کودے گی...... مگر تم نے ایک نہ مانی۔ اب نتیجہ سامنے ہے۔ تم تو ہمیشہ کے سنکی تھے۔ بیٹی بھی سنک گئی ہے۔ اچھا چلو، ایک آخری مشورہ......

ابا جی : کہو کہو، سنے لیتے ہیں۔ تمہارے ہر مشورے کی طرح، یہ مشورہ بھی اسی قابل ہوگا کہ اسے نہ مانا جائے۔ ناصر میاں! ایک بات یاد رکھو! مشورے جو ہر ایک کو ڈھیروں کے حساب سے دیے جاتے ہیں، وہ اسی لیے کہ مفت ہاتھ آتے ہیں......

ناصر میاں : اوں ہوں، سعادت سن تو لو! ماننا نہ ماننا تمہارے اختیار میں ہے۔

ابا جی : سناؤ، سنے لیتے ہیں۔ جس طرح مشورے دینے والے کا کچھ نہیں جاتا، اسی طرح سننے والے کی گرہ سے بھی کچھ نہیں جاتا۔

ناصر میاں : (سنجیدگی سے) دیکھو! تم میری مانو تو سامیہ کو یہاں سے ہٹا دو۔

ابا جی : کک؟ کیا مطلب ہے؟

ناصر میاں : ہٹا دو اُسے یہاں سے!

ابا جی : (کانپتی ہوئی آواز میں) کیوں؟

ناصر میاں : کیونکہ یہاں اس کا ایک دُشمن رہتا ہے۔

ابا جی : (افسردہ لہجے میں) تو میں اپنی بیٹی کا دُشمن ہوں؟

ناصر میاں : تم نہیں!

ابا جی : تو پھر کون؟

ناصر میاں : یہ پانی...... ندی میں بہتا ہوا پانی! پتہ نہیں کب سے کس منزل کی تلاش میں بھٹکتا ہوا پانی......! یہ ترل ترل کرتا ہوا، اپنے آپ میں گم ہمارے سامنے سے گزرتا ہوا...... پانی...... اسے کسی کی پرواہ نہیں۔

ابا جی : (حیرت سے) تم نہ جانے کیا کہہ رہے ہو ناصر میاں!

ناصر میاں : میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سعادت، تم اچھی طرح سمجھتے ہو، پر اپنے آپ کو بہلائے رکھنا چاہتے ہو...... بتاؤ، تمہیں بتاؤ! بھابی صاحب بھی کہتی تھیں یا نہیں کہ یہ پانی بہت سنگ دل ہے...... اور سامیہ بھی یہی کہتی ہے یا نہیں؟ اور میں بھی یہی کہہ رہا ہوں! تم سامیہ کو یہاں سے ہٹا دو...... چلو، کچھ دنوں کے لیے ہی سہی۔

ابا جی : کہاں بھیج دوں؟

ناصر میاں : ہمارے گھر بھیج دو...... کچھ روز ہمارے گھر رہ لے گی۔ چار لوگوں میں ہنسے بولے گی تو بہلی رہے گی۔ جس گھر میں آدمی نہ ہو، اُس میں اور ویرانے میں بھلا کون سا فرق ہے؟

ابا جی : تو...... میں آدمی نہیں ہوں تمہارے نزدیک!

ناصر میاں : نہیں!

ابا جی : پھر......؟ پھر میں کیا ہوں؟

ناصر میاں : آدمی کی پرچھائیں...... اور سامیہ پرچھائیوں میں رہتے رہتے تنگ آچکی ہے۔ اُسے تم جتنی جلدی ہو سکے، یہاں سے ہٹا دو! اور کہیں نہیں تو میرے ہی گھر بھیج دو۔

ابا جی : پوچھوں گا سامیہ سے!

ناصر میاں : پوچھوں گا کا کیا مطلب ہے؟ ابھی بلا کر پوچھ لو۔ تم نہ پوچھنا چاہو تو میں پوچھ لوں۔ پکارو اُسے۔

(پکارتے ہوئے) سامی بیٹے...... سامیہ! او سامیہ۔

سامیہ : (دُور سے) آتی ہوں ابا جی! ابھی آتی ہوں۔

ناصر میاں : اس سے پہلے کہ وہ آئے، ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اگر سامیہ نے ہاں کر دی تو پھر تم اُسے روکو گے نہیں۔ سمجھے؟ میں اُسے ابھی، اِسی

وقت اپنے ساتھ لے کر چلا جاؤں گا۔

اباجی : (بہت دھیرے سے) لے جانا، میرا کیا ہے۔ اس کے بغیر بھی رہ لوں گا۔

[سامیہ کے قدموں کی چاپ............ آتی ہے]

اباجی : سامیہ! بیٹھو بیٹے! دیکھو، تمہارے ناصر چچا کیا کہہ رہے ہیں؟

سامیہ : (بھرائی ہوئی آواز میں) جی ناصر چچا!

ناصر میاں : میں سعادت سے کہہ رہا تھا کہ دو چار روز کے لیے تمہیں میرے یہاں رہنے کی اجازت دے دیں۔ ان دنوں سہیلہ کی بھی چھٹی ہے۔ اکیلی ہڑدنگ مچاتی پھرتی ہے دن بھر...... تمہارے ساتھ رہ کر وہ بھی کچھ سدھر جائے گی۔

سامیہ : (فیصلہ کن انداز میں) نہیں ناصر چچا۔ میں اس گھر کو چھوڑ کر کہیں اور نہیں رہ سکتی۔

ناصر میاں : کیوں؟

سامیہ : یہاں اباجی اور اکیلے ہو جائیں گے۔ پھر، مجھے کھڑکی سے بہتے ہوئے پانی کو دیکھتے رہنے کی عادت ہے۔ اُسے دیکھتے دیکھتے وقت اچھا کٹ جاتا ہے۔ کبھی تھم تھم کر بہتا ہوا پانی، کبھی اُچھلتا ہوا پانی...... کبھی خاموش...... کبھی شور مچاتا ہوا پانی...... پانی بھی ایک دم آدمی جیسا ہے۔

[پس منظر سے ستار پر تیز گت...... پانی کا شور]

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن]

[باورچی خانے کی کھٹ پٹ، ہینڈ پمپ چلانے کی آواز۔ دھیرے

دھیرے چچی امی کی آواز اُبھرتی ہے۔]

چچی امی : (بڑبڑاتے ہوئے) ہے ہے...... غضب خدا کا...... شام سے صبح، صبح سے دوپہر ہونے کو آئی، سورج سوا نیزے پر چمک رہا ہے، صاحبزادے سو رہے ہیں۔ اور جاگیں رات رات بھر، موٹی موٹی کتابیں رٹتے پڑھتے موئی آنکھیں تھک گئیں۔ اِتّی سی عمر میں عینک چڑھالی۔ کتنا کہا، بیٹا صبح سویرے فجر تک اُٹھ کر ہری دُوب پر ٹہلا کرو۔ مگر میری سنتا کون ہے......؟ سہیلہ او سہیلہ (پُکارتی ہے)

سہیلہ : (دُور سے) جی چچی!

چچی امی : ارے وہیں سے چلائے جا رہی ہو گلا پھاڑ کے۔ ذرا سنو گی بھی؟

سہیلہ : آ رہی ہوں۔

(آتی ہے)

چچی امی : ذرا لاٹ صاحب سے کہو کہ ناشتے کا وقت کب کا نکل چکا۔ اب دن کے کھانے کا دسترخوان بچھنے والا ہے۔ اب تو اُٹھ جائیں۔

سہیلہ : کون، عاصم بھائی؟ رات شاید وہ دیر تک جاگتے رہے۔

چچی امی : ارے وہ تو روز ہی ہوتا ہے۔ اللہ نے دن بنایا کام کے لیے۔ رات سونے کے لیے ہے۔ چرندے پرندے تک چین سے سوتے ہیں رات بھر۔ مگر صاحبزادے ہیں کہ اُن کے دماغ میں یہ موٹی سی بات بھی نہیں آتی۔ پڑھنے لکھنے کا فائدہ کیا جب آدمی کا بچہ یہ بھی نہ جان سکے کہ کون سا وقت کس کام کے لیے ہے۔ اے میں کہتی ہوں وقت سے سوؤ، وقت سے جاگو، وقت سے کھاؤ، وقت سے پیو...... وقت سے گھومو...... وقت سے اُٹھو بیٹھو۔

[سہیلہ ہنستی ہے]

چچی امی : ماشاء اللہ کیا تمیز ہے۔ کیا تہذیب ہے؟ بوڑھوں کی ہنسی بچے اُڑائیں۔

سہیلہ : (ہنسی ضبط کرتے ہوئے) تو آپ بات کرتے کرتے ایک ہی جگہ سوئی کیوں گھمانے لگتی ہیں؟

چچی امی : بکو مت! جاؤ جا کر اُٹھا دو اُسے۔ انتڑیاں سوکھ رہی ہوں گی۔ اُٹھے، ناشتہ کرے، چائے پیے، وقت تو دن کے کھانے کا ہے۔ مگر صاحبزادے جب تک ایک کیتلی چائے حلق سے اُتار نہ لیں......

[چچی امی کی آواز اچانک پھنستی ہے۔ کھانسنے لگتی ہیں]

چچی امی : (روہانسی آواز میں) جاؤ...... جگاؤ عاصم کو۔ (کھانسی کا دورہ)

[سہیلہ کے قدموں کی چاپ۔ دُور ہوتی ہوئی۔]

سہیلہ : عاصم بھائی...... عاصم بھائی...... اوں ہوں...... اُٹھتے کیوں نہیں؟

عاصم : کون؟ سہیلہ؟ ارے...... صبح ہو گئی؟

سہیلہ : دو گھنٹے اور پڑے رہے اسی طرح تو شام بھی ہو جائے گی۔ پتا ہے تمہیں اس وقت کیا بج رہا ہے؟

عاصم : (جمائی لیتے ہوئے) کیا بج گئے؟

سہیلہ : ساڑھے گیارہ...... چچی امی مجھ پر بڑبڑا رہی ہیں۔

عاصم : ایں؟ ساڑھے گیارہ؟ تم تو کہہ رہی تھیں شام ہونے والی ہے۔

سہیلہ : تو کیا اسے صبح کہوں؟ ذرا دیر میں سورج ڈھلنے لگے گا۔

عاصم : (ہنس کر) پھر جاڑوں کی رُت آئی...... چھوٹے دن اور لمبی رات۔

سہیلہ : کک...... کیا؟

عاصم : ایک دم کوڑھ مغز ہو تم۔ شعر و شاعری تمہارے بس کی بات نہیں۔

سہیلہ : ہونہہ...... ہو گا۔ تم میری فکر چھوڑو اور جلدی سے ناشتے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

عاصم : آخر ایسی جلدی کیا ہے؟

سہیلہ : وہ آنے والی ہیں نا!

عاصم : کون؟

سہیلہ : سامیہ باجی۔

عاصم : سامیہ۔ (دھیرے سے) سامیہ۔ کیوں؟ کس لیے؟ تم تو کہہ رہی تھیں انہوں نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔

سہیلہ : وہ بھی ذرا جھکی ہیں ناں! پہلے نہیں مان رہی تھیں۔ مگر ابو بھی پیچھے پڑ گئے۔ سعادت چچا کی سمجھ میں بھی آگئی یہ بات۔ وہ ظاہر نہیں کرتے۔ مگر سامیہ باجی کی طرف سے پریشان رہتے ہیں۔

عاصم : (پُرخیال انداز میں) ہوں، یہ تو اچھا نہیں۔

[خاموشی کا وقفہ]

عاصم : یہ تم اس طرح حیرانی سے مجھے گھور کیوں رہی ہو؟ کیا میرے ماتھے پر سینگ نکل آئے ہیں؟

سہیلہ : (ہنستی ہے) ہاں۔ کچھ کچھ نظر تو آرہے ہیں۔ (ایک دم سنجیدہ لہجے میں) تمہیں سعادت چچا کی فکر ہے یا سامیہ باجی کی......؟

عاصم : کیا؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

سہیلہ : ابو کے بارے میں بھی سوچا کبھی؟ کتنے پریشان رہتے ہیں تمہاری طرف سے؟ وہ تو اُن کی عادت ہے ہنسی مذاق کی۔

عاصم : عجیب بات ہے۔

سہیلہ : کون سی بات؟

عاصم : تم نہیں سمجھو گی بنّو۔ اچھا ہے ایک لحاظ سے کہ تم نہ سمجھو۔ سہیلہ، سب کو ایک جیسا نہیں ہونا چاہیے۔

سہیلہ : پہیلیاں نہ بجھاؤ عاصم بھائی۔

عاصم : جو اُداس رہتا ہے، وہ تو ہے ہی۔ تم کہتی ہو جو اوپر سے ہنستا ہے وہ بھی اُداس ہے۔ ابو جی، سعادت چچا...... سامیہ...... اُداسی ایک موسم ہے......

ساری انسانی بستیوں پر پھیلتا ہوا، ایک ایک کو اپنے سائے میں سمیٹتا ہوا۔
[دُور سے دروازے پر زنجیر کھٹکھٹانے کی آواز۔ دروازہ کھلتا ہے]

[فیڈ اِن]

ناصر میاں : اے سہیلہ؟ عاصم......؟

سہیلہ : (زور سے) آئی ابو! (جاتی ہے)

ناصر میاں : عاصم کہاں ہیں؟ ذرا دیکھو تو، کون آیا ہے۔

سہیلہ : ارے...... سامیہ باجی؟ آداب!

سامیہ : (دھیرے سے) آداب۔ کیسی ہو سہیلہ تم؟

سہیلہ : ٹھیک ہوں۔

ناصر میاں : اور بھابی بیگم کہاں ہیں؟ اُنہیں بھی بتا دو ناں کہ سامیہ آئی ہے۔

سہیلہ : باورچی خانے میں ہیں۔ عاصم بھائی کا ناشتہ بنا رہی ہیں۔

ناصر میاں : ناشتہ؟ اس وقت ناشتہ......؟ کچھ خبر بھی ہے، دن کتنا چڑھ آیا؟ (سامیہ سے) سامیہ بیٹی! تم اب یہیں رہو۔ جب تک جی چاہے رہو۔ جی نہ چاہے جب بھی رہو! بھائی سعادت حسین کی فکر چھوڑ دو۔ میں صبح شام ان کی خیر خبر لیتا رہوں گا۔

[چچی امی کھٹ کھٹ کرتی آتی ہیں]

چچی امی : آ گئی، میری بیٹی...... سامیہ، آؤ تمہیں گلے لگا لوں۔ آنکھیں ترس گئی تھیں تمہیں دیکھنے کو۔

سامیہ : آداب چچی امی!

چچی امی : جیتی رہو بیٹی...... اچھا ہوا تم آ گئیں۔ میں تو کب سے زور دے رہی تھی ناصر میاں پر کہ تمہیں بلا لیں کچھ دنوں کو۔

ناصر میاں : تو میں نے آپ کے حکم کی تعلیم کر تو دی بھابی بیگم!

چچی امی : ہاں میاں...... (افسردہ لہجے میں) وہاں سعادت بھائی اکیلے...... یہاں تم اکیلے۔ دُلہن بیگم کے اُٹھتے ہی اس گھر پر بھی جیسے سناٹا چھا گیا۔ عاصم اپنے کمرے میں بند رہتے ہیں۔ ایک سہیلہ کے دم سے ذرا رونق رہتی ہے۔ سہیلہ نہ ہو تو میرا سانس لینا دوبھر ہو جائے۔

ناصر میاں : آپ...... آپ بھابی بیگم...... آپ بھی تو بہت اکیلی ہیں۔ آپ نے اس گھر کے لیے کتنا کیا ہے؟ کیا کچھ کر رہی ہیں؟ یہ گھر آپ ہی کی وجہ سے تو گھر لگتا ہے بھابی بیگم!

[پس منظر سے حزینہ موسیقی کی ایک لہر]

[فیڈ آوٹ]

[فیڈ اِن]

[شام کا سناٹا، دُور بجتی ہوئی گھنٹیاں۔ بہتے ہوئے پانی کی ترل ترل]

سامیہ : عجیب بات ہے عاصم! سوچو تو کتنا عجیب لگتا ہے۔

عاصم : کچھ بھی عجیب نہیں ہے سامیہ...... سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا ہونا چاہیے تھا۔ گئے دنوں میں یہ بستی کتنی خاموش تھی۔ کچی سڑکوں پر اِکا دُکا راہ گیر...... جیتے جاگتے لوگ پرچھائیوں جیسے دِکھائی دیتے تھے۔ اب شور بہت ہے۔

سامیہ : اندر بھی اور باہر بھی۔ سچ مچ بہت شور ہے۔

عاصم : وقت کا دریا بہتا رہتا ہے۔ اس سمٹی سمٹائی ندی کی طرح، تم جس کی لہریں گنتی رہتی ہو۔ اپنی کھڑکی سے آنکھیں لگائے۔

سامیہ : امی کے انتقال کے بعد سے ابا جی بہت چپ رہنے لگے ہیں۔ اس گھر

میں ہر وقت، آٹھوں پہر اُن کی خاموشی گونجتی رہتی ہے۔

عاصم : اور ہمارے گھر میں چچی امی کے بڑبڑانے کی آواز...... اُن کی ڈانٹ ڈپٹ، ایک پل کو بھی چپ ہونے میں نہیں آتیں...... اور ابو...... ہنستے رہتے ہیں۔ سہیلہ کو چھیڑتے رہتے ہیں۔ مگر مجھے پتا ہے۔ چچی امی کی لگاتار ڈانٹ ڈپٹ کی طرح، ابی کی ہنسی کا بھی صرف ایک مطلب ہے۔

سامیہ : کیا؟

عاصم : وہی لمبی چپ...... جس نے سعادت چچا کو گھیر رکھا ہے اور تمہیں گھیر رکھا ہے۔

سامیہ : اور تم؟

عاصم : ہاں، مجھے بھی گھیر رکھا ہے۔

سامیہ : ایسا کیوں ہے عاصم؟

عاصم : ایسا اس لیے ہے کہ ہم خود بھی گھرے رہنا چاہتے ہیں۔ تمہارے ابا جی نے دُوسری شادی نہیں کی۔ ہمارے ابو نے بھی ایسا ہی فیصلہ کیا۔ تمہاری خاطر۔ تمہاری اور صرف تمہاری خاطر سعادت چچا کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھانا چاہتے تھے۔

سامیہ : اور ناصر چچا؟

عاصم : ہاں، ابو کو سہیلہ کی اور میری فکر تھی۔ وہ تو کہو کہ چچی امی ہمارے گھر آئیں، بڑے ابا کے انتقال کے بعد۔ ورنہ شاید ہمارا گھر اور تمہارا گھر دونوں ایک جیسے ہوتے۔

سامیہ : (گھبرا کر) تو کیا یہ دونوں گھر ایک جیسے نہیں ہیں؟

عاصم : (چونک کر) سامیہ!

سامیہ : (کانپتی ہوئی آواز میں) نہیں، نہیں، پہلے تم یہ بتاؤ کہ دونوں گھر کیا

ایک سے نہیں ہیں؟

عاصم : سامیہ......! سامیہ......!! میں تمہارے لیے پریشان ہوں سامیہ۔

سامیہ : میرے لیے؟

عاصم : ہاں، صرف تمہارے لیے۔

سامیہ : کیوں؟

عاصم : کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

سامیہ : اُف، ایسی باتیں نہ کرو کہ مجھے رونا آجائے۔

عاصم : میں نے آج سے پہلے تمہیں کبھی بتایا نہیں۔ بتا دینا چاہتا تھا جب بھی نہیں بتایا۔ پچھلے بہت برسوں سے، جب سے میں نے تمہیں جانا ہے، میں تم سے محبت کرتا آیا ہوں سامیہ۔

سامیہ : اُف، میرے خدا۔ (رونے لگتی ہے)

عاصم : تم رو رہی ہو؟ سامیہ! دیکھو میں کتنا پریشان ہوں تمہارے لیے۔ آج سے نہیں، پچھلے بہت برسوں سے تمہارے لیے پریشان ہوں۔

سامیہ : کس لیے؟

عاصم : اس لیے کہ تم بہت اکیلی ہو۔ سعادت چچا بہت اکیلے ہیں۔ یہ گھر بہت اکیلا ہے۔ یہاں رہتے تم کو اندازہ نہیں کہ تم اندر ہی اندر کتنی سمٹتی جارہی ہو...... یہ بھی تو سوچو کہ ہماری دُنیا ہمارے اَندر ہی نہیں، باہر بھی ہوتی ہے۔ بستیاں، آبادیاں، شہر اور قصبے اور باغ اور بن۔

[دروازے پر دستک، دُور سے آتی ہوئی آواز]

سامیہ : (چونک کر) ابا جی آگئے شاید۔ (جاتی ہے)

[فیڈ اِن]

[ملے جلے قدموں کی چاپ]

ابا جی : تم نے تو ہمیں تھکا دیا سامی! اور عاصم، تم نے بھی نہیں روکا اِسے؟

عاصم : روکا تو تھا۔ بہت روکا تھا۔ سہیلہ نے اور چچی امی نے اور ابو نے، سب نے روکا تھا۔

ابا جی : پھر؟

عاصم : سامیہ کو یہی ضد تھی کہ شام سے پہلے گھر واپس آ جائیں۔

ابا جی : میں تو چار بجے کے قریب اس خیال سے تمہاری طرف گیا تھا کہ ناصر میاں سے مل لوں گا۔ سامیہ سے مل لوں گا۔ گھڑی دو گھڑی وہاں بیٹھوں گا، پھر لوٹ آؤں گا۔ مگر وہاں پہنچتے ہی پتا چلا کہ تم سامیہ کو پہنچانے کے لیے نکلے ہو۔ بھابی بیگم نے روکا، ناصر نے روکا، مگر میں اُلٹے پاؤں واپس چل پڑا۔

[خاموشی کا وقفہ...... پس منظر سے ہوا کا شور اور پانی کی ترل ترل۔ دُور کسی پرندے کی چیخ]

سامیہ : لگتا ہے اپنے ٹھکانے سے دُور تیز ہواؤں میں پھنس گیا ہے۔

ابا جی : کون؟

سامیہ : پرندہ۔

ابا جی : کون سا پرندہ؟

سامیہ : ابھی جس کی چیخ سنائی دی تھی۔

ابا جی : (فکر آمیز انداز میں) سامی بیٹے!

سامیہ : جی ابا جی!

ابا جی : کتنے خوش تھے ناصر میاں جب تم ان کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گئیں۔ کہتے تھے کم سے کم ہفتہ بھر تو تم وہاں رہو گی ہی۔ وہاں سہیلہ

ہے، بھابی بیگم ہیں...... اور...... اور عاصم ہے۔ اور ایک نہ ایک دن تمہیں وہاں جانا ہی ہے۔

سامیہ : (کانپتی ہوئی آواز میں) ابا جی!

عاصم : مجھے اجازت ہے چچا میاں؟

سامیہ : اوہ ہاں...... تم جانا چاہتے ہو عاصم! ٹھیک ہے۔ چائے پینا چاہو تو رُکو۔

عاصم : چائے کی خواہش نہیں ہے چچا میاں۔

سامیہ : کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہے، کل پھر آنا۔

[عاصم چلا جاتا ہے۔ اس کے قدموں کی چاپ دُور ہوتی جاتی ہے۔]

ابا جی : یہ تم نے اچھا نہیں کیا سامیہ۔

سامیہ : جی ابا جی۔

ابا جی : تمہیں وہاں رُک جانا چاہیے تھا۔ ہفتہ بھر کے لیے نہ سہی، ایک دو روز کے لیے ہی سہی۔

سامیہ : (دھیرے سے) جی!

ابا جی : میں نے اس گھر میں جانے سے، عاصم سے ملنے سے، تمہیں کبھی نہیں روکا۔ بھابی بیگم، ناصر میاں، سہیلہ، سب کے سب تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔ ناصر کب سے زور دے رہے ہیں۔ تاریخ مقرر کرنے کے لیے...... میں نے سوچا تھا، تم بچپن سے اس گھر میں آتی جاتی رہی ہو۔ عاصم کی امی کے زمانے تک، تم کتنی بار وہاں جا کر رہی تھیں۔ تمہاری امی نے بھی کبھی نہیں روکا...... اور تم کتنی خوش رہتی تھیں وہاں۔ تو میں...... ناصر میاں سے مل کر تاریخ طے کر لوں۔

سامیہ : (بھرائی ہوئی آواز میں) کیسی تاریخ؟

ابا جی : تمہاری اور عاصم کی شادی کی تاریخ؟

سامیہ : (کانپتی ہوئی آواز میں) ابھی نہیں...... ابھی نہیں ابا جی!

[سانس تیز تیز چلنے لگتی ہے۔]

[فیڈ اِن]

[پس منظر سے ہیجان خیز موسیقی]

[فیڈ آؤٹ]

عاصم : سامیہ! اتنا چھوٹا سا خط پہلے کبھی نہیں لکھا تھا۔ شاید آگے بھی نہیں لکھوں گا۔ تم نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا اور تم نے ہی تو کہا تھا کہ بیداری اور تنہائی ایک ہی سچ کے دو الگ الگ نام ہیں۔ دو اکیلے انسان ملنے کے بعد بھی اکیلے ہی رہتے ہیں۔ اکیلا پن تو ایک احساس ہے۔ ایک رویہ، کوئی کسی کی زندگی میں داخل ہو جائے تو بھی...... اکیلا پن ختم تو نہیں ہو جاتا۔ اکیلے پن کی دیواریں بہت اونچی ہوتی ہیں۔ ٹھیک ہے، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں............ عاصم!

[پس منظر سے تیز رفتار موسیقی کی ایک لہر]

[فیڈ اِن]

[رات کا سناٹا...... ہوا کا شور...... دُور کہیں شیشے کا کوئی برتن ایک چھنا کے کے ساتھ بکھر جاتا ہے]

[فیڈ آؤٹ]

[دروازے پر لگاتار دستک)

ابا جی : (باہر سے) سامیہ، سامیہ! بیٹے سامی!

[سامیہ اُٹھ کر دروازہ کھولتی ہے۔]

سامیہ : (ٹھہرے ہوئے لہجے میں) جی اباجی!

اباجی : یہ کیسی آواز تھی؟ تم کچھ پڑھ رہی تھیں؟

سامیہ : جی! (بھرائی ہوئی آواز میں) عاصم کا خط۔

اباجی : خط؟ کیا ہوا؟ مجھے پوری بات بتاؤ۔

سامیہ : (ٹھہرے ہوئے پُرسکون لہجے میں) ہم دونوں نے اکیلے رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ شادی نہ کرنے کا۔

اباجی : (گھبرا کر) تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے سامیہ!

سامیہ : جی!

اباجی : مگر تم تو کہتی تھیں کہ تمہیں عاصم پسند ہے۔

سامیہ : جی!

اباجی : اور عاصم بھی کہتا تھا، یہی کہتا تھا۔ مجھ سے بھابی بیگم نے، ناصر نے، سہیلہ نے، سب نے یہی کہا تھا۔

سامیہ : جی!

اباجی : جی! جی!! جی!!! تم صاف کیوں نہیں بتاتیں؟ تمہیں نیند تو نہیں آرہی ہے؟

سامیہ : نیند...... نیند تو پوری ہوچکی...... کب کی پوری ہوچکی۔

اباجی : پہیلیاں نہ بجھاؤ سامی!

سامیہ : (خواب ناک لہجے میں) ہم دونوں ہی شاید خواب دیکھ رہے تھے اور نیند میں تھے اور جو کچھ ہوا وہ سب کچھ غیر حقیقی تھا۔

اباجی : سامیہ!

سامیہ : (اُسی رَو میں) اور اب نیند ٹوٹ چکی ہے اور میں جاگ رہی ہوں۔ اور اب اُس خواب کی پرچھائیں بھی باقی نہیں رہی۔ ہم نیند میں ایک دُوسرے کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں، جاگتے ہیں تو ہم سب اپنے آپ کو اکیلا پاتے ہیں۔

اباجی : (ڈراڈرا سا لہجہ، کپکپاتی آواز) سامیہ!

سامیہ : آپ جایئے اباجی اور سو جایئے۔ اور پریشان نہ ہویئے میری خاطر ...... اور ناصر چچا سے کہہ دیجیے کہ وہ بھی پریشان نہ ہوں...... جایئے...... سو جایئے...... ہوا کا شور بھی اب تھم چکا ہے۔ میں جاگ رہی ہوں، جاگ رہی ہوں۔

[دروازہ بند کر لیتی ہے۔]

پس منظر سے اختتامیہ موسیقی کی ایک تیز گت۔

فیڈ آؤٹ

OO

آپ اپنا تماشائی

آپ اپنا تماشائی

کردار :

(۱) غالبؔ : جوانی میں/ بڑھاپے میں

(۲) راوی (۱) : کبھی سامنے نہیں آتے۔ نثر و نظم کے اقتباسات پڑھتے ہیں، پس منظر سے۔

(۳) راوی (۲) :

(۴) بھجن منڈلی / پجارنیں

(۵) قصائی

(۶) میوہ فروش

(۷) بزاز

(۸) مہاجن

(۹) کلکتے کے شاعر...... درجن بھر

(۱۰) مغنی / فقیر

(۱۱) شفق

(۱۲) مجروح

(۱۳) تفتہ

(۱۴) پرچھائیں

[Audio) صوتی تاثرات، موسیقی]

[Light Effects...... روشنی...... چرخی...... بدلتے ہوئے رنگ]

موسیقی: Signature tune

[پردہ اُٹھتا ہے]

ڈائریکٹر کی آواز : صاحبو! ہم سب آپ اپنے تماشائی ہیں، اور یہ تماشا، ہماری زمین اور زمانے کے اسٹیج پر جاری ہے۔ اس تماشے کا سلسلہ صبح ازل سے شروع ہوا تھا...... یہ سلسلہ شام ابد تک یوں ہی چلتا رہے گا۔ ایک ایک کرکے اس تماشے کے تمام کردار رُخصت ہوتے جائیں گے۔ پرانے کرداروں کی جگہ نئے کردار آتے رہیں گے...... آتے رہیں گے اور جاتے رہیں گے...... مرزا غالبؔ کو رُخصت ہوئے بھی زمانہ گزرا۔ اُنیسویں صدی گزری، پھر بیسویں صدی گزری...... اور اب اکیسویں صدی کا اسٹیج ترتیب دیا جا رہا ہے...... یہ صدی بھی یوں ہی گزر جائے گی۔ لیکن غالبؔ کا تماشا ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔

ہر زمانے کے دُکھ سکھ میں، ہر درد کے قصوں میں مرزا غالبؔ شامل ہیں۔ اسی لیے، ان کے واسطے سے ہم پر اپنی زندگی اور اپنے زمانے کے بھید کھلتے جاتے ہیں۔ یہ قصہ یوں ہی چلتا رہے گا...... غالبؔ آج بھی

ہمارے ساتھ ہیں...... (موسیقی)

[پردہ اُٹھتا ہے]

[پہلا منظر]

[ابتدائی موسیقی...... غالبؔ کی گلی، دیوڑھی، چوکی پر بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ بوڑھی شبیہ، روشنی کا دائرہ غالبؔ کے گرد۔]

پہلا راوی : (پس منظر سے گونجیلی آواز) سنو! عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح، جہاں روحیں آرام کرتی ہیں اور ایک عالم آب و گل...... یہ دُنیا...... جہاں ہماری ہستی آپ اپنا تماشا دیکھتی ہے۔

[روشنی کا دائرہ پھیل جاتا ہے...... Light Effects]

دوسرا راوی : (پس منظر سے) قاعدۂ عام یہ ہے کہ اس دُنیا کے مجرم اُس دُنیا میں پہنچنے کے بعد سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ اُس دُنیا کے گنہگاروں کو اس زمین پر نہ بھیج کر سزا دیتے ہیں۔

[روشنیوں کا تاثر]

[دوسرا منظر]

فیڈ اِن : بھجن منڈلی۔

[دائیں دروازے سے بھجن منڈلی داخل ہوتی ہے۔ اسٹیج کے وسط میں ٹھہر جاتی ہے۔]

منڈلی :

ماٹی کہے کمہار سے تو کا روندھے موہے
اک دن ایسا ہوئے گا، میں روندھوں گی توہے

چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دوئی پٹ بھیتر آئے کے ثابت گیا نہ کوئے
میرا مجھ میں کچھ نہیں، جو کچھ ہے سب تور
تیرا تجھ کو سونپتے، کیا لاگت ہے مور

[اسٹیج پر روشنی دُھندلی ہوتی جاتی ہے۔ اندھیرا، عقبی پردہ روشن ہوتا ہے۔ غالبؔ کی پرچھائیں اُبھرتی ہے۔]

پہلا راوی : (پس منظر سے)

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زُلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

دُوسرا راوی : (پس منظر سے) بنارس خوب شہر ہے اور مجھے پسند ہے۔ انتہائے جوانی میں میرا یہاں آنا ہوا ہے۔ اس موسم میں جوان ہوتا تو یہیں رہ جاتا۔ ایک مثنوی میں نے اس شہر کی تعریف میں لکھی ہے۔ ''چراغ دیر'' اس کا نام ہے۔

[اسٹیج پر تین پجارنیں آرتی سنبھالے آتی ہیں۔ گھنگھروؤں کے ساتھ۔ پس منظر سے شنکھ کی آواز۔ اسٹیج دھیرے دھیرے روشن ہوتا ہے۔ غالبؔ کی پرچھائیں ختم ہو جاتی ہے۔]

[پجارنوں کا خاموش رقص]

پہلا راوی : (پس منظر سے) یہ شہر خوبی، زمین کی جنت ہے۔ اس شہر کی ہوا مردہ جسموں میں روح پھونک دیتی ہے۔ مقدس گنگا کی لہریں اِس شہر کے دامن کو اپنی پیشانی سے چومتی ہیں۔ چاروں طرف، دلفریبی کا یہ حال ہے کہ پردیس میں ہونے کا غم جاتا رہا...... پری چہرہ حسینوں کا جلوہ دیکھنے کے لائق ہے۔

شنکھ کی آواز بلند ہوتی ہے تو دل پر نشہ سا چھا جاتا ہے۔ دُشمنوں کی ہنسی کا ڈر نہ ہوتا تو ماتھے پر تلک لگا کے گنگا کنارے جا بیٹھتا......

[پجارنوں کا رقص]

[فیڈ اوٹ]

[غالبؔ کی شبیہ]

پردہ

[فیڈ اِن]

[تیسرا منظر]

غالبؔ کی ڈیوڑھی

[دائیں دروازے سے پانچ افراد داخل ہوتے ہیں۔ سب کے سب دُکاندار اور تجارت پیشہ ہیں۔ دو ہندو، تین مسلمان...... ڈیوڑھی کے سامنے تالی بجاتے ہیں۔ کوئی جواب نہیں۔ آپس میں بات چیت کرنے لگتے ہیں۔]

پہلا (قصائی) : ہم کب سے مرزا نوشہ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ جانے کب واپس آئیں گے اور ادائیگی کریں گے۔

دوسرا (میوہ فروش) : کتنی ادائیگی باقی ہے؟

پہلا : اجی صاحب چھے مہینے کی۔ پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملی۔ دو سیر گوشت روز آتا ہے۔

دوسرا : ہماری دُکان سے میوے منگواتے ہیں۔ اب تو جاتی ہوئی بہار ہے۔ دو چار روز میں آم بازار سے غائب ہو جائیں گے۔ دو مہینے کا بقایا ہے۔

تیسرا (بزاز) : اماں تم دو مہینے کے بقایے کو رو رہے ہو۔ ہم سے تو پچھلی عید پر کشمیری فرغل لیا تھا۔ حد ہو گئی۔

[دروازے پر پھر صدا لگاتا ہے۔]

چوتھا (گندھی) : کیا کروں...... کہاں سے لاؤں؟

پانچواں (مہاجن) : بھیا ہمارے تو بھاگ اُجڑ گئے۔ سوچا تھا رئیس جادے ہیں۔ کہیں بھاگ تو نہ جاویں گے۔ پر کب سے گئے ہیں۔ آنے کا نام نہیں لیتے۔ جب پوچھو، یہی پتہ چلتا ہے کہ پردیس میں ہیں۔ ہائے مرجا صاحب! ہم تو ڈوب گئے۔

(Light Effects)

پہلا آدمی : (پس منظر سے) اپنا تماشائی آپ بن گیا ہوں۔ رنج و ذِلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصوّر کر لیا ہے۔

دوسرا آدمی : جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں لو غالبؔ کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اِتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر ہوں اور فارسی داں ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔

پہلا راوی : لے! اب قرضداروں کو جواب دے۔ ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ۔ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں...... اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے؟ او غلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو بولو۔

کچھ تو اکسو......

دوسرا راوی : بولے کیا، بے حیا، بے غیرت۔ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا۔ میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دُوں گا۔

[اسٹیج پر اندھیرا ہوتا جاتا ہے۔ عقبی پردے پر غالبؔ کی پرچھائیں بتدریج اُبھرتی ہے۔]

پہلا راوی : (پس منظر سے، گونجیلی آواز، بازگشت کے ساتھ) خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، فقیر، نکبت میں گرفتار...... وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود، در بدر بھیک مانگے...... وہ میں ہوں!

دوسرا راوی : (دھیما، خود کلامی کا انداز) زیست بسر کرنے کو تھوڑی سی راحت درکار ہے۔ باقی حکمت اور سلطنت، اور شاعری اور ساحری، خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا، اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دُنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا۔ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے، اے یار جانی!

[اندھیرا]

[چوتھا منظر]

[کلکتے کی محفل مشاعرہ...... درجن بھر شاعر، جوان بوڑھے یکجا ہیں۔ غالبؔ کا انتظار ہو رہا ہے۔]

پہلا شاعر : کیوں صاحب! اِس بزمِ سخن کی نظامت کے لیے ہم میں سے کون ہے جو مرزا افضل کے نام پر متفق نہ ہوگا۔

کئی آوازیں : (ایک ساتھ) سبحان اللہ! سبحان اللہ، ہم سب اِس نظرِ انتخاب کی داد

دیتے ہیں۔

[مرزا افضل کھڑے ہو کر آداب بجا لاتے ہیں۔]

دوسرا شاعر : مرزا افضل کی زبان بھی چلتی ہے، ہاتھ پاؤں بھی۔

تیسرا شاعر : تو کیا؟ خدانہ خواستہ کسی انہونی کا اندیشہ ہے؟

پہلا شاعر : حضت...... کسی کو کیا معلوم؟ سابقہ اس عزیز سے ہے جسے اپنی شاعری سے زیادہ ناز اپنے بزرگوں کے پیشۂ سپہ گری پر ہے۔

دوسرا شاعر : (تمسخر کے انداز میں) ''سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری''

تیسرا شاعر : ''کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے!''

دوسرا شاعر : امر واقعی ہے! ایسی شاعری ذریعہ عزت ہو بھی نہیں سکتی۔

چوتھا شاعر : سنا ہے حضت کو کلکتے آئے آج پانچواں دن ہے۔

تیسرا شاعر : مگر امتحان کی تو یہ پہلی گھڑی ہے حضت کے لیے۔

[سب ہنستے ہیں۔]

پہلا شاعر : اُنہیں اپنی زباندانی پر ناز بہت ہے۔

دوسرا شاعر : اپنی تعریف میں سفیر ہرات کا ایک بیان دوہراتے پھرتے ہیں۔

پہلا شاعر : کیا؟

دوسرا شاعر : یہی کہ حضت زبان پارسی کے عالم ہیں۔

پہلا شاعر : ہوں گے۔ سنا ہے قتیل تک کو خاطر میں نہیں لاتے۔

تیسرا شاعر : برخود غلط بہت ہیں۔ اس پر بھی حالت یہ ہے کہ کلکتے کے سفر میں بے تحاشہ رنج اُٹھائے۔ وسائل محدود، مگر دماغ عرش معلیٰ پر۔

[خدمتگار داخل ہوتا ہے۔]

خدمت گار : آگئے، مرزا نوشہ آگئے۔ دلّی والے مرزا نوشہ۔

[سب ہنستے ہیں۔ پہلا شاعر خدمت گار کو اشارہ کرتا ہے۔]

خدمت گار : (نقیبوں کے انداز میں) رئیس ابن رئیس، نجم الدولہ، دبیر الملک، نواب مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، تشریف لاتے ہیں ں ں ں..........

[سب ایک دُوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ غالبؔ داخل ہوتے ہیں۔ سب کورنش بجالاتے ہیں، تمسخر کے انداز میں]

[غالبؔ سب پر متانت سے نظر ڈالتے ہیں۔]

پہلا شاعر : جناب والا...... یہاں ایسے اصحاب بھی موجود ہیں جن کو آپ کے کمالاتِ فن کا کچھ علم نہیں۔ بہتر ہوگا کہ بطور تعارف کچھ شعر......

غالب : عرض کرتا ہوں۔

[سب کے سب ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔]

غالب : (شعر پڑھتے ہیں)

اے تماشائیان بزم سخن
دی مسیحا دمان نادرہ فن

پہلا شاعر : حضت آپ تو فارسی میں رواں ہو گئے۔ ہم بھلا فارسی کیا سمجھیں؟ (طنزیہ لہجے میں) زبان ریختہ میں کچھ فرمائیں۔

غالب : (تحت میں)

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل
زنہار، اگر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے

[سامعین کی طرف سے مکمل خاموشی]

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

[سب ایک دُوسرے کو دیکھتے ہیں۔ بزم میں سناٹا، بتدریج روشنیاں دھیمی ہونے لگتی ہیں۔ سب سایوں کی طرح ساکت بیٹھے ہوئے ہیں۔]

[فیڈ اِن]

مغنی : (بغیر ساز کے، ترنم سے، پس منظر سے)

ساقی، بہ جلوہ دُشمنِ ایمان و آگہی
مطرب، بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر، تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

[فیڈ آؤٹ]

غالب : (تحت میں) آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ، صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

[اندھیرا............ پردہ گرتا ہے]

[پانچواں منظر]

[غالبؔ کی ڈیوڑھی۔ غالبؔ چوکی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے منشی ہرگوپال تفتہؔ، نواب انوارالدولہ شفقؔ، میر مہدی مجروحؔ۔]

غالبؔ : عزیزو! قلندری و آزادگی کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں، بقدر ہزار یک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں...... اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسّی کے لٹکاؤں اور پیادہ پا چل پڑوں، کبھی شیرازہ جا نکلا، کبھی مصر

میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا...... سنتے ہو مرزا تفتہ؟

مرزا تفتہ : انشا اللہ وہ ساعت مبارک بھی آئے جب آپ اس سفر سے مشرف ہوں۔ کیوں بھائی شفق! بھائی مجروح!!

شفق اور مجروح : (ایک ساتھ) انشا اللہ۔ مگر اس وقت تو کلکتے کے سفر کا کچھ احوال بیان فرمایئے۔

غالب : (مسکراتے ہوئے) کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
میاں...... کتنے زخم ہرے ہو گئے۔

مرزا تفتہ : آپ فرماتے تھے کہ سفر صعوبت بھرا تھا۔

غالب : رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مجروح : زندگی کے سفر میں ہم بے اختیار سہی، مگر قبلہ! یہ تو آپ کا اپنا انتخاب تھا۔

غالب : یاد کرو! میر صاحب فرما گئے ہیں......
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
ہم سب تو بس بے اختیار راہ میں ہیں۔

شفق : مولائی! کچھ ہم بھی تو جانیں کہ آپ کن تجربوں سے گزرے۔

غالب : (کچھ سوچنے لگتے ہیں، مختصر وقفے کے بعد) بنارس سے کلکتے کا سفر کشتی پر ہونا تھا۔ کشتی بانوں نے بدمعاگی کی۔ سو، طے کیا کہ یہ دُشوار گزار راستہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے طے ہوگا۔ چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے لیلائے مراد کی زُلف سنواروں۔ اس خطا کی پاداش میں دُنیا کی کون سی مصیبت تھی جو میں نے نہ جھیلی ہو......

[وقفہ]

غالب : گردِ راہ کی طرح گرتا پڑتا، کوہ و بیاباں میں ہر قدم پر پتھروں اور

کانٹوں کی دھار پر چلتا ہوا، کبھی راتوں کی سردی سے افسردہ و پریشان، اور کبھی گردش ایام کی ستم گری سے نالاں، چوتھی شعبان کو دن کا کچھ وقت گزرنے پر کلکتے پہنچا۔

[وقفہ]

غالبؔ : خیر! اب تو پھر وہی ہم ہیں، اور وہی دکھیاری دلّی...... ہماری دلّی! لڑکپن کے زمانے کا ایک شعر ہے......

گر مصیبت تھی تو غربت میں اُٹھا لیتے اسدؔ
میری دہلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

[سب کے چہروں پر حسرت و تاسف کا تاثر۔ خاموشی۔ چرخی Light Effects]

[پس منظر میں دھماکے، شور شرابا
چیخیں، بھاگتے ہوئے لوگ
کانپتی ہوئی روشنیاں، آندھی اور طوفان کا تاثر، بادل گرجتے ہیں۔
اندھیرا...... مکمل خاموشی۔ اسٹیج پر دھندلی روشنی۔]

غالبؔ : (چوکی پر تنہا بیٹھے، اپنے آپ سے)

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

مغنی : (پس منظر سے)

اک کھیل ہے، اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے، اعجاز مسیحا مرے آگے

غالبؔ : ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے، ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

[غالبؔ چپ ہو جاتے ہیں، Light effects، کچھ لکھنے لگتے ہیں۔]

[Sad Music]

پہلا راوی : (پس منظر سے) میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے......

دوسرا راوی : (پس منظر سے) میں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت سے، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر۔ شہر سے نکل نہیں گیا۔

پہلا راوی : شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ جرنیلی بند وبست، یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ، پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔

دوسرا راوی : ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اُسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنا شروع کی۔

پہلا راوی : وہ ایک جنم تھا کہ جس میں طرح طرح کے معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔

دوسرا راوی : حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں، یعنی میری بھاوج...... جے پور میں پڑے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ اُن کو نہیں بھیجا۔

پہلا راوی : ایک پیسے کی آمد نہیں۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ ایک

بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے۔ کلو، کلیان، ایاز، یہ باہر۔ مداری کے جورو بچے بدستور گویا مداری موجود ہے...... محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے...... آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت نہیں، ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں......

دوسرا راوی : مرے ہوؤں کے نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ، اللہ...... ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں۔ میں مروں گا مجھ کو کون روئے گا......

[موسیقی کی ایک لرزہ خیز لہر۔ روشنی کانپتی ہوئی]

[اندھیرا]

[چھٹا منظر]

[پرچھائیاں...... عورتیں، مرد، بچے، مسلسل گردش]

[پس منظر سے موسیقی]

پہلا راوی : دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں...... کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا......

دوسرا راوی : مسجد جامع سے راج گھاٹ کے دروازے تک، بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو، کئی بانس نشیب تھا، وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔

پہلا راوی : فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اٹ گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔

[پرچھائیوں کی گردش بہت دھیمی]

دوسرا راوی : پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی...... ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔

پہلا راوی : شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا۔

دوسرا راوی : اللہ اللہ...... دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں، واہ رے حسن اعتقاد...... ارے بندۂ خدا...... اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں؟ دلّی واللہ اب شہر نہیں، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر......

پہلا راوی : یہاں شہر ڈھے رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار، اور اردو بازار، اور خانم کا بازار...... کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتہ نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبان امکنہ و دُکا کین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دُکان کہاں تھی...... غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے......

[اچانک مردنگ اور کھڑتال کی آوازیں گونجتی ہیں۔ دائیں دروازے سے بھجن منڈلی اسٹیج پر آتی ہے۔ عقبی پردے کی پرچھائیں غائب۔ اسٹیج روشن ہو جاتا ہے۔]

[ساتواں منظر]

[اسٹیج پر بھجن منڈلی، کبیر داس کا بھجن، دُوسرے دروازے سے پجارنیں

اسٹیج پر آتی ہیں۔ بھجن منڈلی کورس میں بھجن گاتی ہے۔]

کون ٹھگوا نگریا لوٹل ہو

کون ٹھگوا نگریا لوٹل ہو

[کمار گندھرو کی دھن پر، ریکارڈنگ موجود ہے]

[پجارنیں اِسی دھن پر رقص کرتی ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے اسٹیج کی روشنیاں مدھم پڑتی ہیں اور سب کے سب نکل جاتے ہیں۔ عقبی پردے پر غالبؔ کی شبیہ اُبھرتی ہے۔]

وقفہ

[پس منظر سے راوی کی آواز]

پہلا راوی : کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ یقین سمجھنا کہ سن کر رونا آیا۔

فقیر : (دُور سے)

درد منت کش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی

حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

درد منت کش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

[فقیر دھیرے دھیرے اسٹیج پر آتا ہے۔ وسط میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ عقبی پردہ بتدریج روشن ہوتا ہے۔ پرچھائیں غائب۔ پس منظر سے بجلی چمکتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں، برسات اور آندھی کا تاثر۔ فقیر آسمان کی طرف دیکھتا ہے......]

پہلا راوی : انسان کے درد اور دُکھ کا یہ تماشا، ازل سے جاری ہے۔ ابد تک جاری رہے گا۔

دوسرا راوی : آج اکیسواں دین ہے۔ ۱۸۶۳ء کی جولائی کا اٹھیسواں دن۔ آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو اگر کبھی کبھی تارے دِکھائی دیتے ہیں، تو لوگ اُن کو جگنو سمجھ لیتے ہیں...... مبالغہ نہ سمجھنا...... ہزار ہا مکان گر گئے۔ سینکڑوں آدمی جابجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔

پہلا راوی : برسات خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی، سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔

[صوتی تاثرات............Lights Effects]

دوسرا راوی : چھتیں چھلنی ہوگئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹے بھر برسے۔ کتابیں، قلم دان، سب توشے خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے، کہیں چلمچی دھری ہوئی ہے......

[بارش کا تاثر...... جھکڑ، طوفان]

مغنی/فقیر : [صدا لگانے کے انداز میں]

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

[فیڈ آوٹ...... اسٹیج پر بتدریج اندھیرا]

[آٹھواں منظر]

[Change Over...... موسیقی...... حزنیہ اور دھیمی]

[غالبؔ اپنی چوکی پر نیم دراز ہیں۔ کھانسی کا دورہ، ہانپنے لگتے ہیں]

غالب : (اپنے آپ سے) ہوچکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ...... ایک مرگ ناگہانی اور ہے۔

پہلا راوی : (پس منظر سے) میں اب انتہائے عمر ناپایدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام ہوں۔ ہجوم امراض جسمانی اور آلام روحانی سے زندہ در گور۔

دوسرا راوی : اس نمائش گاہ کی سیر سے، جس کو دُنیا کہتے ہیں، دل بھر گیا۔ اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں۔

پہلا راوی : ہر دم دم نزع ہے۔ دل غم سے خوں ریز ہوگیا ہے۔ کسی بات سے خوش نہیں ہوسکتا۔ مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات کا طالب ہوں۔

[روشنیاں کانپتی ہیں۔ غالبؔ ہانپنے لگتے ہیں۔ پس منظر سے مغنی کی آواز، دھیما سر، ترنم حزن آمیز]

مغنی :

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یا رب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

[فیڈ آؤٹ]

غالبؔ : [بھرائی ہوئی آواز، خود کلامی کا انداز]
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
[لرزہ خیز موسیقی، روشنیاں کانپتی ہیں۔]

[اندھیرا]

[نواں منظر]

[ایک اسٹیج پر کلکتے کے تمام شاعر موجود ہیں۔ دوسری طرف بھجن منڈلی، پجارنیں۔ غالبؔ کے احباب، سب کے سب خاموش، ساکت، پس منظر سے ستار پر دھیمی گت......... چرخی Light Effects]

[اسی گت پر پجارنوں کے گھنگھروؤں کی جھنکار]

پہلا راوی : تو صاحبو! تماشا ابھی جاری ہے۔ ہماری دُنیا کے وسیع و عریض اسٹیج پر،

ازل سے ابد تک کا یہ تماشا...... یوں ہی جاری رہے گا۔

دوسرا راوی : ہم سب آپ اپنے تماشائی ہیں۔ تماشا اور تماشائی، دونوں ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے۔

پہلا راوی : اس نے کہا تھا......

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

دوسرا راوی : اس نے کہا تھا......

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

پہلا راوی : اس نے کہا تھا......

اسدؔ بزم تماشا میں تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے تو آنکھیں ڈھانپ ہم تصویر عریاں ہیں

دوسرا راوی : اس نے کہا تھا............ (گونجتی آواز)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

پہلا راوی : مگر سب کچھ ہمارے سامنے ہی تو نہیں ہوتا۔ دُنیا بہت کچھ دیکھتی ہے، مگر سب کچھ تو نہیں!

دوسرا راوی : یہ تماشا ہمارے باطن کی دُنیا میں اس بے حد و حساب اسٹیج پر بھی جاری رہتا ہے جس پر ہمارے وجود کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

پہلا راوی : اس نے دو آنکھوں کے علاوہ اس تیسری آنکھ سے، جسے دُنیا دیدۂ بینا کہتی ہے، باطن کے اسٹیج پر جاری وہ تماشا بھی دیکھا جو ہم سب کو مقدر ہے۔

دوسرا راوی : تم سب اپنے زمان و مکان، اپنی تاریخ اور اپنے جغرافیے کے قیدی

ہو۔ اسی دائرے میں گردش کر رہے ہو۔ وہ اس دائرے سے نکل گیا ہے۔

پہلا راوی : نکل گیا ہے اور ہر دَور کے تماشے میں شامل ہے۔ ہر اسٹیج کا تماشائی ہے۔

دوسرا راوی : مگر اس وقت...... وہ ہے کہاں......؟

[اسٹیج کے تمام کردار ایک دائرے میں حرکت کرتے ہیں۔ پس منظر سے ستار پر دھیمی گت۔]

پہلا راوی : ہاں صاحبو! وہ ہے کہاں؟ وہ ہمیں دِکھائی کیوں نہیں دیتا؟

[Light Effects...... روشنیاں کانپتی ہیں، موسیقی کی لرزہ خیز لہر]

ایک آواز : (تماشائیوں کے درمیان، ہال میں بیچ کہیں سے آتی ہوئی) میں اس ہجوم میں بیٹھا ہوا، دُور سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا...... میں جو آپ اپنا تماشائی ہوں۔

[سب کے سب چونک پڑتے ہیں۔]

آواز : صاحبو...... تم بلاتے ہو تو میں آتا ہوں۔ میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں۔

[ہال میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ تماشائیوں کی صف سے غالبؔ نکلتے ہیں۔ چھڑی ٹیکتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھتے ہیں۔ پس منظر کی موسیقی تیز ہو جاتی ہے۔ اسٹیج کے تمام کردار ساکت ہو جاتے ہیں۔ Freeze]

[غالبؔ جمے ہوئے قدموں سے ان کے قریب پہنچتے ہیں، ایک ایک کو غور سے دیکھتے ہیں، پھر سب کے بیچ میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔]

[موسیقی کی لرزہ خیز لہر]

ایک آواز : تماشا ختم نہیں ہوا...... تماشا جاری ہے۔

[فیڈ آؤٹ............ ڈراپ]

○○

پس نوشت

''آپ اپنا تماشائی'' اور اِس کتاب میں شامل دُوسرے کھیل صرف میری اپنی کہانی پر مبنی نہیں ہیں۔ یہ کہانی بہتوں کی ہے۔ اور بقول میرا جی، دھرتی سے پرانی نہ سہی، لیکن بہت نئی بھی نہیں ہے۔ پچھلے دو ڈھائی سو برسوں میں ہماری اجتماعی زندگی اور ہمارا اپنا وجود ایسے بہت سے مسئلوں کی زد پر آئے ہیں جو خود ہمارے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ سر سیّد کی فرمائش پر لکھی جانے والی اپنی فارسی تقریظ میں غالبؔ نے جہاں کئی باتیں درست کہیں، وہیں اُنہوں نے ایک مشکوک سچائی کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ وقت کے ساتھ ہر پرانا آئین بدل جاتا ہے۔ زندگی کے کچھ آئین کبھی نہیں بدلتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے معاشرتی منظرنامے میں بدلاؤ سے زیادہ بگاڑ کی صورتیں نمودار ہوتی رہی ہیں ورنہ حالات شاید اتنے ابتر نہ ہوتے۔ ہمارا حال کتنا عجیب حال ہے۔

مجھے سب سے زیادہ بے کلی اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی بدہیئتی اور ابتری کی وجہ سے ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جس طرح لارنس کو بدصورتی کے ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کو دیکھ کر اپنے اجتماعی زوال اور محرومی کا احساس ہوا تھا، اُسی طرح مجھے بھی، موجودہ زندگی کے زیادہ تر تماشے بے چین اور افسردہ کرتے ہیں۔ دُنیا کا حال تو خراب ہے ہی، مگر ہماری اپنی حالت بھی خرابی کی جس حد کو پہنچ چکی ہے، اس کے بعد اب باقی کیا رہ گیا ہے۔ تشدد، تنگ نظری، طرح طرح کے تعصبات، ہوا اور ہوس کا ایک اندھا سیلاب سب کچھ نگل جانے کو تیار ہے۔ دُنیاداری نے اچھے اچھوں کو کہیں کا نہ رکھا۔ ہماری اجتماعی زندگی کی مختصر ترین اکائی، یعنی

گھر اور خاندان کا نقشہ جس تیزی کے ساتھ تباہ ہوا ہے، اس نے انسانی تعلقات اور رشتوں کا بھرم ذرا بھی باقی نہیں رہنے دیا۔ یہ ڈرامے اِسی صورت حال کے ایک عجیب و غریب سلسلے میں پروئے ہوئے ہیں۔ بہ ظاہر یہ تمام قصے عام زندگی کے ہیں۔ غیر معمولی لوگ، غیر معمولی واقعات، غیر معمولی مقاصد کے بجائے میرا سروکار دراصل اسی عام زندگی سے ہے۔ اور ان سب کھیلوں میں اسی سچائی کا اظہار ہوا ہے، ایک عام اور سیدھی سادی سطح پر۔

مجھے فیشن ایبل تصورات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جادوئی حقیقت نگاری کی طرح، غیر معمولی یا انوکھے اور اَنہونے واقعات کا اب کچھ بھی مطلب نہیں رہ گیا ہے۔ نائپال نے کہیں لکھا تھا کہ......

''بڑی سے بڑی انسانی واردات، عام زندگی کی سطح پر اور عام تجربوں کے دائرے میں ہی رونما ہوتی ہے۔ ''جادوئی حقیقت نگاری'' کے بھید میں پڑنا محض بے وقوفی ہے۔''

......انسان کے روز مرہ تجربوں کی جھولی میں کیا کچھ نہیں ہے؟ شاید اسی لیے ان ڈراموں میں بھی کہیں کسی انہونے نتیجے یا انجام کا سراغ نہیں ملے گا۔ یہ تو انسانی واردات کا ایک سلسلہ ہے جو چلتے چلتے بس کہیں ٹھہر جاتا ہے اور تمثیل ختم ہو جاتی ہے۔

یہ ڈرامے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وجود میں نہیں آئے۔ ۱۹۶۵ء میں یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد، نوکری کی تلاش نے مجھے سب سے پہلے مدھیہ پردیش کے شہر اندور تک پہنچا دیا۔ وہاں ان دنوں عمیق حنفی ریڈیو میں پروگرام ایکزیکیوٹیو تھے۔ وندھیا چل کے سائے میں سانس لیتی ہوئی زندگی نے مجھے بہت جلدی موہ لیا۔ عمیق حنفی کے ساتھ وقت اچھا گزرتا تھا۔ پھر سیّد وقار حسین بھی اندور آ گئے اور ہماری زندگی میں شامل ہو گئے۔ عمیق حنفی کے سندباد کی شہرت دُور تک پھیل چکی تھی۔ ان ہی کی ترغیب اور تقاضے پر میرا پہلا ڈراما ''آخری کش'' کے عنوان سے لکھا گیا۔ اس ڈرامے کے پروڈیوسر بھی عمیق حنفی تھے۔ میں تو اسے اتفاق ہی سمجھتا ہوں کہ میری اور اُن کی یہ مشترکہ کوشش خوب ٹھکانے لگی۔ اس کے ۱۰۰ سے زیادہ نشریے سنے گئے۔ اس کے بعد تو یہ سلسلہ زوروں سے چل نکلا۔ ڈراموں کے چار

مجموعے دیکھتے دیکھتے نہ صرف یہ کہ شائع ہو گئے، ان کی پذیرائی بھی میری اُمید سے زیادہ ہوئی۔ کئی ڈرامے یونیورسٹیوں کے نصابات کا حصہ بنے۔ یہ تفصیل پھر کبھی بیان کی جائے گی۔ فی الحال یہاں میں اپنے چاروں مجموعوں کی تعارفی عبارتوں سے کچھ اقتباسات دوہرائے دیتا ہوں، تاکہ میرے موقف کی کچھ وضاحت ہو جائے۔

''مجھے لوگوں سے ملنے جلنے، باتیں اور بحثیں کرنے کا شوق بہت کم ہے۔ مگر انسان اور اس کی کائنات کے مختلف مظاہر سے دلچسپی ہمیشہ قائم رہی ہے۔ بیزاری اور برگشتگی کے شدید لمحوں میں بھی درخت، پرندے، منظر اور چہرے میں نے کتابوں کی صورت پڑھے ہیں، صرف آنکھوں سے نہیں بلکہ حواس کی ان تمام قوتوں کے ساتھ جو میرے اختیار میں ہیں اور جن کے اشتراک سے محرومی کی ساعتوں میں اچھی سے اچھی کتاب بھی میرے لیے بامعنی نہیں بنتی۔''

(مٹی کا بلاوا)

○○

''وقت...... اِن ڈراموں میں بھانت بھانت کے روپ بدل کر سامنے آیا ہے۔ وہ جو گزر گیا، وہ جس کا گٹھر ہم اُٹھائے پھرتے ہیں، گزرتے ہوئے کل اور آج کا مرکب...... اور وہ وقت جو اب آنے والا ہے۔
میں نے وقت کی پہچان اکثر ایک لفظ سے کی ہے...... زوال! اس پہچان کے نشانات پچھلی کتاب ''مٹی کا بلاوا'' میں بہت نمایاں تھے۔ اِن ڈراموں میں بھی اُن کی تکرار دِکھائی دے گی۔ ہوشمند لوگ ہوسکتا ہے کہ اسے ایک طرح کی قنوطیت پسندی سے تعبیر کریں مگر ہر شخص کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں اور ہر لکھنے والے کے اپنے تجربے۔
کیا کروں کہ کچھ مجبوریاں ساتھ ہیں اور کچھ تجربوں سے آنکھیں بار بار

دوچار ہوتی ہیں۔ وہ چہرے جو کھوئے گئے، موسم جو گزر گئے، مکان جو
ملبوں میں چھپ گئے اور بستیاں جو اُجڑ گئیں، ان کا تماشا ہر پل ساتھ
ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ بہت سے رشتوں، قدروں، مفروضوں اور
ایقانات کے بچھڑنے کا تجربہ بھی ہوا اور وہ کچھ، جو اُن کی جگہ آج سامنے
ہے، محرومیوں کے احساس کو دُور نہ کر سکا۔
پھر بھی، دِل کوئی بہانہ ڈھونڈتا ہے، اور آنکھیں بھی، جو کچھ اب تک کا دیکھا
بھالا ہے، اس کے آگے کچھ اور چاہتی ہیں۔"

(مجھے گھر یاد آتا ہے)

○○

"زندگی کو میں نے دیکھا ہے اس کے عام رنگوں اور عام معاملات کے
واسطے سے...... یہی واسطہ میرے لیے زندگی کی شناخت اور تفہیم، دُنیا سے
نفرت اور محبت، زندگی کی طرف سے مایوسی اور اُمید کی سطحیں فراہم کرتا
ہے۔ "مٹی کا بلاوا" اور "مجھے گھر یاد آتا ہے" کے بعد، ڈراموں کی اس
تیسری کتاب میں بھی بناؤ اور بگاڑ کے وہی تماشے موجود ہیں جن کا تعلق
عام انسانوں اور زندگی کے عام رویوں سے ہے۔
مگر پھر بھی، زندگی کے بھید بہت گہرے ہیں، ناقابلِ فہم اور منطق سے ماورا!

(زندگی کی طرف)

○○

"(بازار میں نیند کے) یہ ڈرامے بھی کچھ جیتی جاگتی آنکھوں کا تجربہ ہیں، کچھ
خوابوں کی صورت سامنے آئے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ زندگی کا وہ حصہ جو
خوابوں میں بسر ہوا، کسی بھی طرح اس حصے سے کم گنجان اور وسیع نہیں ہے

جس کا تعلق بیداری سے ہے۔ میرے لیے خواب اور بیداری حواس پر
گزرنے والی دو کیفیتیں کبھی نہیں رہیں۔ یہ دونوں حواس کے دو منطقے ہیں،
جن کے مابین ایک مضبوط رشتہ ہمیشہ استوار رہا۔ میں اپنی سوجھ بوجھ اور داخلی
ضرورت کے مطابق ایک سے دوسرے منطقے میں برابر آتا جاتا رہتا ہوں۔
روزمرہ کی غیر رسمی واردات سے ہٹ کر، کوئی بھی تجربہ شخصی ہو یا اجتماعی، مجھ
تک بالعموم ایک فکری اور تہذیبی سیاق کے ساتھ پہنچتا ہے۔ اسی وجہ سے،
اظہار کی کسی بھی شکل کو میں اقدار کے سوال سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا۔

(بازار میں نیند)

○○

خیر...... ڈراموں کے کسی قاری یا سامع یا ناظر کے لیے یہ غیر ضروری باتیں ہیں۔ ان کا مقصد صرف اپنے تخلیقی اور فکری موقف کی نشاندہی تھی۔ میرے لیے سب سے بڑا ڈراما عام زندگی کے قصے ہیں۔ میں خواہ مخواہ کی تجربہ پسندی کا قائل نہیں ہوں۔ لیکن ایک دو تجربے ڈراموں میں جو کیے گئے ہیں، انہیں لوگوں نے توجہ کے قابل سمجھا۔

اس چھوٹے سے انتخاب میں، میری کوشش یہ رہی ہے کہ تہذیبی اور معاشرتی، عشقیہ اور غیر رومانی، سیاسی اور فکری، مربوط اور بہ ظاہر بے تکے یا مہمل (Absurd) ہر طرح کے کچھ تماشے یکجا ہو جائیں۔ ''تخلیق کار پبلشرز'' (دہلی) کے مہتمم انیس امروہوی اور اُن کی رفیقہ حیات ڈاکٹر نیر جہاں کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے جنہوں نے رنگا رنگ اور کاروباری دَور میں ایک غیر دلچسپ لکھنے والے کی یہ غیر دلچسپ کتاب چھاپنے کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ مجھے دونوں عزیز ہیں۔ دُعا ہے کہ خدا اُنہیں خوش رکھے۔ کتاب کا ٹائٹل میری نواسی منیزہ کی تلاش کا نتیجہ ہے۔

○○

ذاکر باغ، اوکھلا روڈ
نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

— شمیم حنفی
۲۶ راگست ۲۰۱۳ء

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	پھول جیسے لوگ (ناول)	انور خان	120.00
۲۔	یادبسیرے (افسانے)	انور خان	80.00
۳۔	لمحوں کی قید (افسانے)	کشور سلطانہ	40.00
۴۔	انتخاب افسانہ ۸۹ء (افسانے)	مرتب: انیس امروہوی	60.00
۵۔	قند وقند (طنز ومزاح / نیا ایڈیشن)	فیاض احمد فیضی	150.00
۶۔	برزخ (افسانے)	ہاجرہ شکور	40.00
۷۔	فرات (ناول)	حسین الحق	100.00
۸۔	کیا مذاق ہے (مزاحیہ شاعری)	اسمٰعیل آذر	80.00
۹۔	گھٹتے بڑھتے سائے (افسانے)	علی امام نقوی	50.00
۱۰۔	بھوکا ایتھوپیا (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	110.00
۱۱۔	اردو تنقید حالؔی سے کلیم تک (تحقیق)	سید محمد نواب کریم	200.00
۱۲۔	دل کی بات (افسانے)	ڈاکٹر شبیر صدیقی	60.00
۱۳۔	اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ (تنقید)	ڈاکٹر محبوب اعلیٰ قریشی	125.00
۱۴۔	پیاسا سمندر (افسانے)	عقیلہ تبسم	60.00
۱۵۔	ڈار سے بچھڑے (افسانے)	سید محمد اشرف	100.00
۱۶۔	غالبیات اور ہم (تحقیق)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	50.00
۱۷۔	آخری داستان گو (ناول)	مظہر الزماں خاں	60.00
۱۸۔	ساغؔر نظامی: حیات اور ادبی خدمات (تحقیق)	ڈاکٹر سلمٰی شاہین	100.00
۱۹۔	ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے (سفرنامہ)	پروفیسر علیم اللہ حالؔی	50.00
۲۰۔	مرزا رسؔوا کے ناولوں کے نسوانی کردار (تحقیق)	ڈاکٹر توحید خاں	80.00
۲۱۔	راہ میں اجل ہے (افسانے)	زاہدہ حنا	100.00
۲۲۔	اپٹا اور اردو ڈراما (تحقیق)	شاہد رزمی	60.00
۲۳۔	کنیادان (ڈرامے)	وجے تنڈلکر (اردو ترجمہ: ڈاکٹر صادق)	80.00
۲۳۔	منڈیر پر بیٹھا پرندہ (افسانے)	احمد صغیر	60.00
۲۴۔	حجاب امتیاز علی: حیات اور ادبی کارنامے (شخصیت)	مجیب احمد خاں	80.00
۲۵۔	اردو فکشن کی تنقید (تنقید)	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	250.00

۲۶۔	سنگ اُٹھانے کا حوصلہ (افسانے)	رضاء الجبار	80.00
۲۷۔	شاخیں (مضامین)	ڈاکٹر علیم اللہ حالی	60.00
۲۸۔	جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب (افسانے)	مرتب: انیس امروہوی	90.00
۲۹۔	ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک (سفرنامہ)	ڈاکٹر قمر رئیس	100.00
۳۰۔	ادب میں گھوسٹ اِزم (طنز و مزاح)	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	80.00
۳۱۔	رابطہ (تنقید)	جوگندر پال	90.00
۳۲۔	سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ (افسانے)	حسین الحق	80.00
۳۳۔	قمر رئیس: ایک زندگی (شخصیت)	مرتب: ڈاکٹر سلمیٰ شاہین	250.00
۳۴۔	بے اصطلاح (مضامین)	جوگندر پال	90.00
۳۵۔	ٹھہرے ہوئے لوگ (افسانے)	انجم عثمانی	80.00
۳۶۔	اردو افسانے کا پس منظر (تنقید)	فیاض رفعت	60.00
۳۷۔	بے ارادہ (افسانے)	رفیع حیدر انجم	80.00
۳۸۔	ادب کی تفہیم (تنقید)	ڈاکٹر شمس الحق عثمانی	80.00
۳۹۔	آئینے کی گرد (افسانے)	شکیل جاوید	80.00
۴۰۔	سب رس: جدید اردو میں (تنقید)	قاضی انیس الحق	200.00
۴۱۔	وینس کا پھول (افسانے)	سہیل اعجاز صدیقی	90.00
۴۲۔	موسم عذابوں کا (افسانے)	علی امام نقوی	80.00
۴۳۔	شام اودھ (ڈرامے)	ڈاکٹر شبیر صدیقی	100.00
۴۴۔	اردو کے نثری اسالیب (تنقید)	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	150.00
۴۵۔	کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ (تنقید)	ڈاکٹر ابرار رحمانی	200.00
۴۶۔	جھلتے جنگل (ناول)	انور عظیم	100.00
۴۷۔	اردو افسانے پر مغربی ادب کے اثرات (تنقید)	ڈاکٹر شہناز شاہین	160.00
۴۸۔	پرندے (افسانچے)	جوگندر پال	110.00
۴۹۔	ہوئے ہم دوست جس کے (شخصی خاکے)	مجتبیٰ حسین	100.00
۵۰۔	معاصر اسلامی تحریکات اور فکرِ اقبال (تنقید)	ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی	150.00
۵۱۔	زندہ اپنی باتوں میں: بیدی، عصمت اور عباس (انٹرویوز)	فیاض رفعت	100.00
۵۲۔	اردو میں قصیدہ نگاری (تنقید)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	200.00
۵۳۔	لابوہیم (افسانے)	انور عظیم	150.00

۵۴۔ مٹی کے حرم (ناول) — ساجدہ زیدی — 250.00

۵۵۔ مکالمہ (آجکل کے اداریے) — محبوب الرحمٰن فاروقی — 200.00

۵۶۔ اردو شاعری کے روشن چراغ (تذکرہ) — طارق متین باغپتی — 100.00

۵۷۔ مشرقی ہند میں اردو نکڑ ناٹک (تحقیق) — ڈاکٹر محمد کاظم — 100.00

۵۸۔ اصطلاحاتِ نفسیات: تشریح و تفہیم — سیّد اقبال امروہوی — 250.00

۵۹۔ کارواں گزر گیا (افسانے) — ایم۔ایچ۔خان — 150.00

۶۰۔ حاضر حال جاری (افسانے) — سریندر پرکاش — 250.00

۶۱۔ واپسی سے پہلے (افسانے) — صغیر رحمانی — 150.00

۶۲۔ نادیہ (ناول) — جوگندر پال — 150.00

۶۳۔ ادراکِ فن (تذکرہ) — اختر شاہ جہانپوری — 150.00

۶۴۔ گمشدہ آدمی (افسانے) — یٰسین احمد — 150.00

۶۵۔ جدید نفسیات (نفسیاتی مضامین) — سیّد اقبال امروہوی — 150.00

۶۶۔ غمِ دل وحشتِ دل (ناول) — ڈاکٹر محمد حسن — 250.00

۶۷۔ بلونت سنگھ: فن اور شخصیت (تحقیق) — ڈاکٹر ممتاز آراء — 200.00

۶۸۔ بھگت سنگھ کی واپسی (ڈرامے) — ساگر سرحدی — 150.00

۶۹۔ مسیحا کی موت (افسانے) — قاضی انیس الحق — 200.00

۷۰۔ شہرِ نگاراں (ناول) — رفعت سروش — 200.00

۷۱۔ رسالہ ''جامعہ'' کا تنقیدی مطالعہ (تحقیق) — ڈاکٹر فرزانہ خلیل — 300.00

۷۲۔ فساد (ناول) — مہرالدین خاں — 100.00

۷۳۔ گلدستۂ بیت بازی (شاعری) — مرتب: ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی — 200.00

۷۴۔ انتخاب کلیات ن۔م۔راشد (شاعری) — مرتب: مرغوب علی — 180.00

۷۵۔ تنقیحات (تنقیدی مضامین) — ڈاکٹر نیر جہاں — 120.00

۷۶۔ مضامین ہفت رنگ (تنقیدی مضامین) — محبوب الرحمٰن فاروقی — 200.00

۷۷۔ جوگندر پال کی کہانیاں (افسانے) — جوگندر پال — 180.00

۷۸۔ جوشؔ ملیح آبادی: خصوصی مطالعہ — مرتب: ڈاکٹر قمر رئیس — 200.00

۷۹۔ تپش (افسانے) — ولی محمد چودھری — 150.00

۸۰۔ نثری بیانیہ (تنقید) — ڈاکٹر مجید بیدار — 150.00

۸۱۔ پرائی چیز (بچوں کی کہانیاں) — شکیل جاوید — 120.00

۸۲۔ گزرگاہِ خیال (مضامین)	پروفیسر ساجدہ زیدی	200.00
۸۳۔ روداد انجمن (رپوتاژ)	حمید اختر	200.00
۸۴۔ عورت: زندگی کا زنداں (مضامین)	زاہدہ حنا	250.00
۸۵۔ اُردو ناول کے اسالیب (تنقید)	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	250.00
۸۶۔ ایک کتاب اور...... (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	150.00
۸۷۔ روزمرہ کی نفسیات (نفسیاتی مضامین)	سید اقبال امروہوی	180.00
۸۸۔ مولانا شبلی: ایک تنقیدی مطالعہ (تنقید)	ڈاکٹر نیّر جہاں	250.00
۸۹۔ نقد نگاہ (تنقید)	لطف الرحمٰن	200.00
۹۰۔ قمر رئیس: ادبی و علمی شناخت (شخصیت)	مرتب: خوشنودہ نیلوفر	200.00
۹۱۔ پریم چند: نئے تناظر میں (تنقید)	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	200.00
۹۲۔ عورت اور سماج (تنقید)	ڈاکٹر محمد شہزاد شمس	140.00
۹۳۔ وہ بھی ایک زمانہ تھا (فلمی شخصیات)	انیس امروہوی	280.00
۹۴۔ خیال کی مسافت (مضامین)	شمیم حنفی	300.00
۹۵۔ سفر کہانی (پاکستانی سفرنامہ)	مرغوب علی	120.00
۹۶۔ ناکام محبت: ساحر لدھیانوی (شخصیت)	اظہر جاوید	180.00
۹۷۔ پردہ ہے ساز کا (شعری مجموعہ)	ساجدہ زیدی	150.00
۹۸۔ پھر سوئے حرم لے چل (سفرنامۂ حج)	سہیل انجم	100.00
۹۹۔ صحرائی شب و روز (ناول)	سُنیل گنگوپادھیائے (مترجم: نوٹن مکھرجی، اے۔آر۔منظر)	120.00
۱۰۰۔ جاتے جاتے (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	150.00
۱۰۱۔ راستہ بند ہے (ناول)	مصطفیٰ کریم	220.00
۱۰۲۔ رات، شہر اور زندگی (مضامین)	شمیم حنفی	220.00
۱۰۳۔ نقوشِ جاوداں (سوانح)	ڈاکٹر شمس کمال انجم	200.00
۱۰۴۔ دکنی نثر پر ایک نظر (تنقید)	ڈاکٹر مجید بیدار	200.00
۱۰۵۔ قندِ مکرر (طنز و مزاح)	فیاض احمد فیضی	150.00
۱۰۶۔ شالملی (ناول)	ناصرہ شرما	150.00
۱۰۷۔ دُور نہیں منزل (ناول)	دلشاد امروہوی	150.00
۱۰۸۔ اُردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات (تحقیق)	سید تنویر حسین	160.00

۱۰۹۔ سخنورانِ عہد پہلوی (تذکرہ)	ڈاکٹر غلام اشرف قادری	180.00
۱۱۰۔ گھنگھرو ٹوٹ گئے (سوانح عمری)	قتیل شفائی	440.00
۱۱۱۔ سایہ اونچے پیڑ کا (افسانے)	شکیل جاوید	150.00
۱۱۲۔ جہانِ فکشن (تنقید)	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	220.00
۱۱۳۔ کلاسیکی شاعری کا مطالعہ (تنقید)	ڈاکٹر فاطمہ بیگم پروین	200.00
۱۱۴۔ رشتوں کی دیوار (افسانے)	اکرام الدین شبنم	140.00
۱۱۵۔ دہلیز سے اُترے پاؤں (افسانے)	شکیل جاوید	150.00
۱۱۶۔ ایک اور چکمہ (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	160.00
۱۱۷۔ چار دیواری (ناول)	شوکت صدیقی	500.00
۱۱۸۔ سیپیوں میں سمندر (شاعری)	رام اوتار گپتا مضطر	150.00
۱۱۹۔ یہ خلد بریں ارمانوں کی (شہروں کا تذکرہ)	مرتب: ڈاکٹر شکیل اختر	300.00
۱۲۰۔ غارِ حرا میں ایک رات (سفرنامہ)	مستنصر حسین تارڑ	300.00
۱۲۱۔ جائزہ انیس (تنقید)	ڈاکٹر عسکری صفدر	200.00
۱۲۲۔ اُردو سیکھنے کا نیا طریقہ	ڈاکٹر سید تنویر حسین	100.00
۱۲۳۔ جہانِ دگر (افسانے)	فیاض رفعت	300.00
۱۲۴۔ ڈوبتے سورج کی روشنی (افسانے)	رئیس نجمی امروہوی	150.00
۱۲۵۔ ترسیل (مکتوبات بنام اختر شاہجہاں پوری)	مرتب: مدہوش بلگرامی	150.00
۱۲۶۔ رام دین (مضامین)	ممتاز مفتی	250.00
۱۲۷۔ تتلیاں ڈھونڈنے والی (افسانوی مجموعہ)	زاہدہ حنا	250.00
۱۲۸۔ نشیب و فراز (ناول)	بنت فاطمہ نقویہ	250.00
۱۲۹۔ صاعقہ (ناول)	رضیہ بٹ	250.00
۱۳۰۔ لیکن (شاعری)	جونؔ ایلیا	200.00
۱۳۱۔ گویا (شاعری)	جونؔ ایلیا	250.00
۱۳۲۔ پس پردہ (فلمی مضامین)	انیس امروہوی	200.00
۱۳۳۔ بدن کی جمالیات (مضامین)	حقانی القاسمی	180.00
۱۳۴۔ کلیات احسان عظیم آبادی (شاعری)	مرتب: ڈاکٹر محمد عبدالقادر احقر عزیزی	300.00
۱۳۵۔ گیت میرے میت (شاعری)	اسحاق ساجد	200.00
۱۳۶۔ سفیر آخر شب (شاعری)	رام اوتار گپتا مضطر	150.00

۱۳۷۔ مضامینِ حجاب (مضامین)	شاہجہاں جعفری حجاب امروہوی	200.00
۱۳۸۔ خواب در خواب (افسانے)	ڈاکٹر صبیحہ انور	160.00
۱۳۹۔ وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ (تنقید)	ڈاکٹر محمد یوسف قریشی	200.00
۱۴۰۔ حرفِ کائنات (اقوالِ زریں)	مرتب: عابد سہیل	180.00
۱۴۱۔ آزادی کے بعد اُردو مضامین میں طنز و مزاح (تنقید)	ڈاکٹر شیخ سیادت علی	280.00
۱۴۲۔ نفسیات کے معمار (شخصیات)	سید اقبال امروہوی	300.00
۱۴۳۔ سمندر اجنبی ہے (افسانے)	کرامت غوری	200.00
۱۴۴۔ دُعائے نیم شب (شاعری)	شاہجہاں جعفری حجاب امروہوی	160.00
۱۴۵۔ سکندر کا مقدر (ناول)	ڈاکٹر سلیم خان	250.00
۱۴۶۔ دلّی جو ایک شہر تھا (مضامینِ شاہد احمد دہلوی)	مرتب: فیاض رفعت	250.00
۱۴۷۔ اُردو کلچر اور تقسیم کی وراثت (مضامین)	شمیم حنفی	280.00
۱۴۸۔ آخری فیصلہ (ڈراما: مہیش دتانی) مترجمین: ڈاکٹر نوتن مکھرجی، اے۔ آر۔ منظر		140.00
۱۴۹۔ ڈوبتے اُبھرتے جزیرے (شخصیات)	ڈاکٹر مجید بیدار	250.00
۱۵۰۔ میں نے یہ سوچا نہ تھا (شعری مجموعہ)	رما کانت شرما اُدبھرانت	120.00
۱۵۱۔ مثنوی یوسف زلیخا (تنقیدی تدوین)	ڈاکٹر احمد علی شکیل	220.00
۱۵۲۔ شکستہ ستون پر دھوپ (ناول)	عطیہ حسین/ترجمہ: انتظار حسین	300.00
۱۵۳۔ تاریخ خواجہ خواجگان (تاریخ)	پروفیسر شمس طہرانی	300.00
۱۵۴۔ آڑے ترچھے آئینے (مضامین)	محمد حسن	300.00
۱۵۵۔ اُردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات (تنقید)	ڈاکٹر ایم۔ عظیم اللہ	280.00
۱۵۶۔ نظریات (مضامین)	فہیم بسمل	180.00
۱۵۷۔ رضاء الجبار کی تخلیقی حسیت (تحقیق)	ڈاکٹر میمونہ منظور	300.00
۱۵۸۔ خیالات عقیل (مختلف کتابوں پر تبصرے)	مرتب: ڈاکٹر ہاجرہ کوثر	300.00
۱۵۹۔ فلمی نگری کا اندھیرا اُجالا (فلمیات)	شفیق احمد	200.00
۱۶۰۔ مکھوٹوں کے درمیان (ڈرامے)	صادقہ نواب سحر	250.00
۱۶۱۔ فٹ پاتھ کی زبانی (ناول)	حبیب کیفی	150.00
۱۶۲۔ گمان (شاعری)	جون ایلیا	200.00
۱۶۳۔ تفہیم (مضامین)	اختر شاہجہاں پوری	200.00
۱۶۴۔ میرے شب و روز (سوانح)	احمد السبائی/ترجمہ: عذرا نقوی	150.00

۱۶۵۔ ملامتی (ناول)	حبیب کیفی	140.00
۱۶۶۔ جدید اُردو ریڈر	ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی	060.00
۱۶۷۔ جدید اُردو افسانے کا تکنیکی مطالعہ (تحقیق)	ڈاکٹر حمید اللہ خاں	240.00
۱۶۸۔ بہشت زہرا (ناول)	ناصرہ شرما	360.00
۱۶۹۔ اُنگلیاں خاموش ہیں (شاعری)	ڈاکٹر ممنون حسن خاں ممنونؔ	200.00
۱۷۰۔ بے داغ حاشیے (شاعری)	ڈاکٹر حسین احمد اعظم	160.00
۱۷۱۔ افکارِ اقبال (تحقیق)	ڈاکٹر غلام عمر خاں	250.00
۱۷۲۔ بدلتے موسم کی خوشبو (شاعری)	غلام عباس خان خادمؔ	150.00
۱۷۳۔ بدلتے موسم کی خوشبو (شاعری، ہندی)	غلام عباس خان خادمؔ	200.00
۱۷۴۔ وطن (ڈرامے)	ڈاکٹر اظہار صہبائی	150.00
۱۷۵۔ بولتی ناگن (افسانوی مجموعہ ہندی)	ڈاکٹر سلیم خان	300.00
۱۷۶۔ کہی اَن کہی (افسانے)	علی امام نقوی	160.00
۱۷۷۔ حُسن علم (مرثیے)	حسنینؔ امروہوی	150.00
۱۷۸۔ پنجاب اور دبستان داغ (تحقیق)	ڈاکٹر شہناز چاندنی	250.00
۱۷۹۔ تجلیٔ طور (شاعری)	طورؔ سہسوانی (مرتب احمد جمال ابدالی)	300.00
۱۸۰۔ سلگتے ارمان (افسانے)	ڈاکٹر احمد علی شکیل	160.00
۱۸۱۔ دردِ دل لکھوں کب تک (شاعری)	رُخسار امروہی	350.00
۱۸۲۔ فیض احمد فیض : احوال و افکار (مضامین)	مرتب : مرغوب علی	500.00
۱۸۳۔ دردِ دل لکھوں کب تک (شاعری/ ہندی)	رُخسار امروہی	200.00
۱۸۴۔ شریر بیوی (مزاحیہ افسانے)	مرزا عظیم بیگ چغتائی	160.00
۱۸۵۔ زر پرست سرپرست (ناول)	ڈاکٹر سلیم خان	340.00
۱۸۶۔ اَدھوراپن (شاعری/ ہندی، اُردو)	ثقلین جوالاپوری	200.00
۱۸۷۔ آوارہ بگولے (افسانے)	فاطمہ حسن	160.00
۱۸۸۔ جہاں بنالیں اپنا نشیمن (مضامین)	عذرا نقوی	220.00
۱۸۹۔ ہوائیں خلاف تھیں (شعری مجموعہ)	گُمار سائل	200.00
۱۹۰۔ مہر و وفا (ناول)	ڈاکٹر سلیم خان	250.00

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

54-C / 5, Ist Floor, J - EXTENSION, LAXMI NAGAR, DELHI-110092

PH. 011-22442572, 9811612373 E-mail : qissey@rediffmail.com
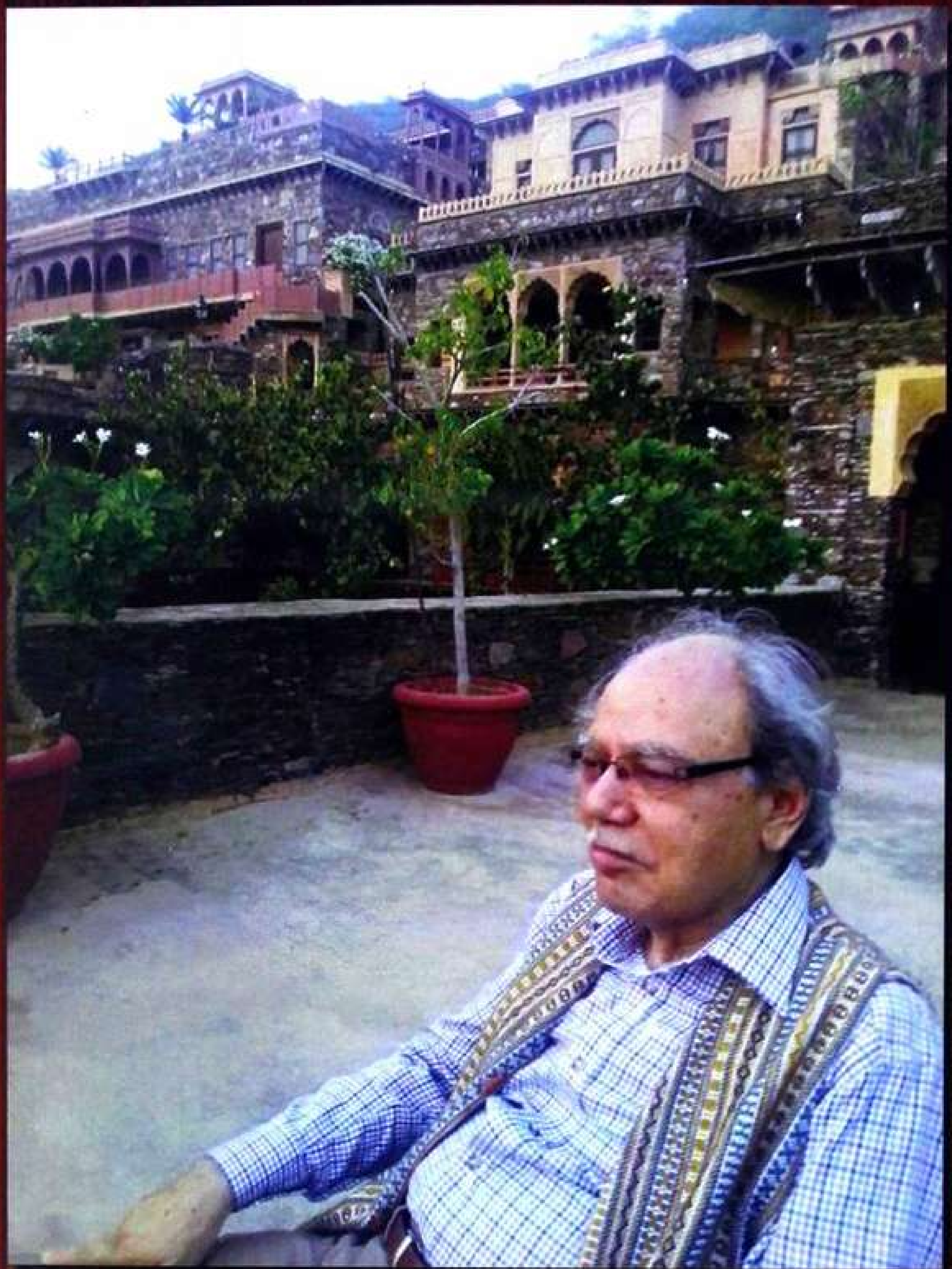
شمیم حنفی

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
54-C/5, J-Extension, Laxmi Nagar, Delhi - 110092
Ph: 011-22442572, 9811612373 Email: qissey@rediffmail.com